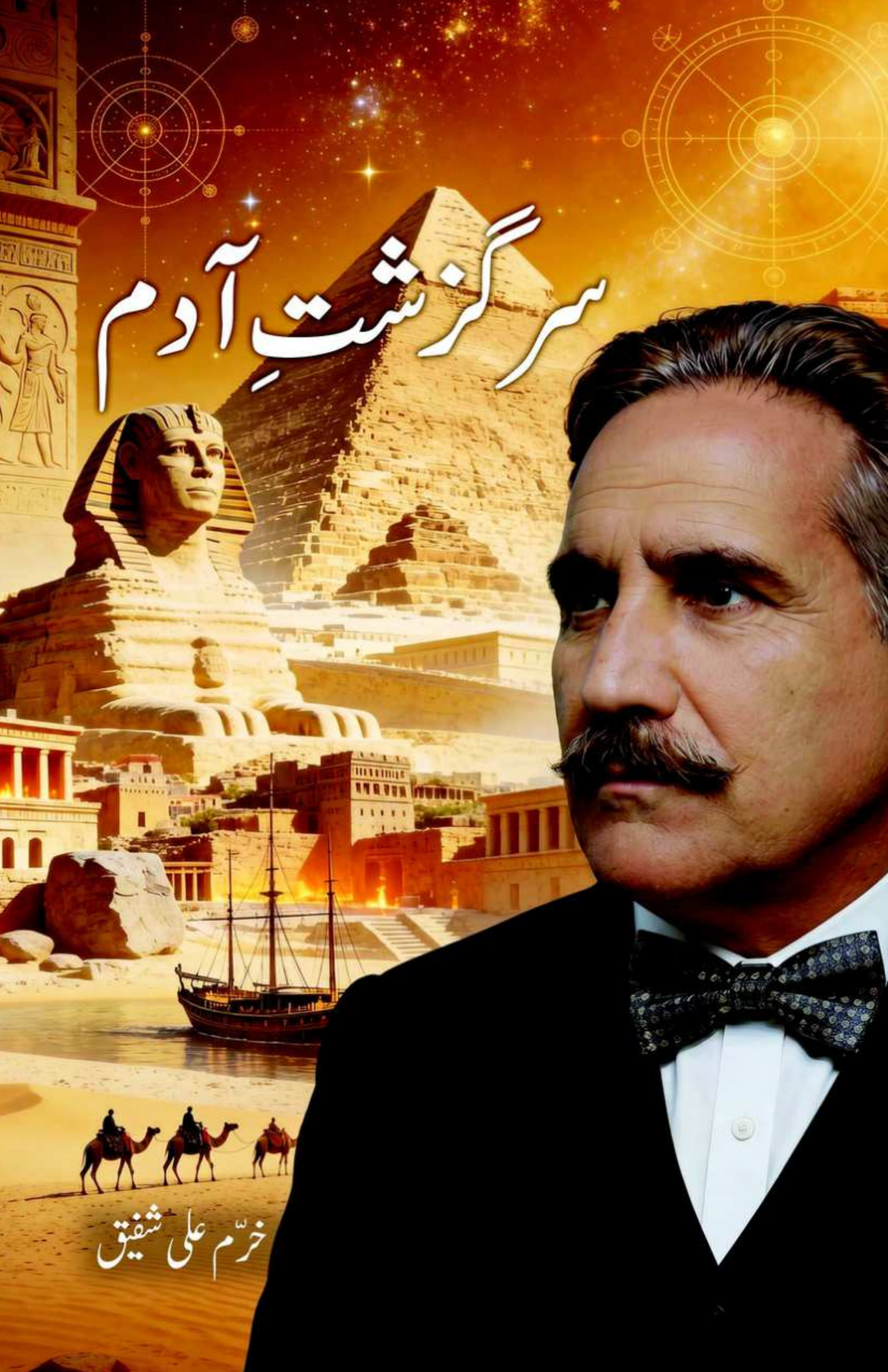
سرگزشتِ آدم
خرّم علی شفیق

سرگزشتِ آدم

قدیم زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

خرّم علی شفیق

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

کاپی رائٹ © ۲۰۲۶ء

مصنف اپنے اخلاقی حقوق کا اعادہ کرتا ہے۔

کتاب کے جملہ حقوق بحق الہجرہ سکولز ٹرسٹ محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حصہ کاپی رائٹ کے مالک کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر مطبوعہ صورت میں شائع نہیں کیا جا سکتا۔

اِس کتاب کا برقی نسخہ (ڈیجیٹل الیکٹرانک کاپی) بین الاقوامی لائسنس:

Creative Commons Attribution-NoDerivatives 4.0 International (CC BY-ND 4.0)

کے تحت جاری کیا گیا ہے، جس کی رو سے کتاب کو ڈیجیٹل طور پر بلا معاوضہ شیئر کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ مصنف اور ناشر کے نام واضح طور پر برقرار رکھے جائیں، اور متن اور مواد میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے۔

ISBN: 978-627-7400-03-3

ناشر:

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

Millat College Building
Near Khana Pul, Service Road East
VIP Ghauri Town, Islamabad Expressway
Islamabad, Pakistan
Phone: +92512248915
Email: info@alhijrah.pk

پہلی بار پاکستان میں الہجرہ سکولز ٹرسٹ نے ۲۰۲۶ء میں طبع کروا کے شائع کی۔

چونکہ مذہب ہمارے پورے وجود کا احاطہ کرتا ہے،
اس لیے اس کی تاریخ ہماری نشوونما کی پوری تاریخ
کا خلاصہ ہونی چاہیے۔

اگسٹس کومٹ [1]

---

[1] یہ قول علامہ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں اپنے انگریزی لیکچر 'The Muslim Community—A Sociological Study' ("ملتِ بیضا پر عمرانی نظر") میں نقل کیا تھا۔ اِس قول کے مصنف فرانسیسی مفکر (Augustus Comte) کے نام کی مروجہ اُردو اِملا "اوگست کومتے" ہے، لیکن اقبال نے پیامِ مشرق میں اسے "اگسٹس کومٹ" لکھا ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تُو خاکی ہے یا کہ سیمابی!

اقبالؔ

فہرس

	پہلی بات	7
باب ۱	انسان زمین پر	17
باب ۲	برفانی امتحان	32
باب ۳	تہذیب کا آغاز	42
باب ۴	چھوٹے ملک، بڑے عزائم	54
باب ۵	وحدت کی تلاش	78
باب ۶	روحانی تجربے	111
باب ۷	نئی منزلیں، نئے راستے	136
	حوالے	157

پہلی بات

اِس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ اصل میں ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی تاریخ ہے جس کا خاکہ علامہ اقبال نے خود بنایا تھا۔

اِس بات کو سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اقبال اپنی فارسی مثنوی اسرار و رموز کا دُوسرا حصہ مکمل کر رہے تھے۔ اچانک مستقبل کے بہت سے واقعات اُن کے ذہن میں آنے لگے۔ آیندہ صدیوں میں جو کچھ پیش آنے والا تھا، اُن کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ حیران تھے کہ کیا اُسے تحریر کرنا چاہیے؟ آخر اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور ایسا کریں گے۔ اُنہوں نے اپنے ایک قریبی دوست کو خط میں لکھا:

> [مثنوی کا] دُوسرا حصہ قریبُ الاختتام ہے۔ مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح امڈے آرہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصہ کا مضمون ہو گا "حیات مستقبلۂ اسلامیہ" [مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ] یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامیہ جس کی تاسیس [یعنی بنیاد] دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر اِن سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔

میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل [یعنی ظاہری الفاظ کے بجائے پوشیدہ معانی تلاش کرنے کے طریقے] سے کام لیا گیا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اُس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم [یعنی خفیہ علم] مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات و سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اِتنے طویل عرصہ کے بعد مندرجہ بالا نتیجہ پر پہنچا ہوں۔

مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔ بہرحال میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا اشاعت ہو جائے گی۔[1]

چونکہ اقبال کی کتابوں میں "حیات مستقبلۂ اسلامیہ" یا مسلمانوں کی آیندہ تاریخ کے عنوان سے کوئی تصنیف دکھائی نہیں دیتی اِس لیے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اقبال یہ کتاب لکھے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ دُوسروں کی طرح مَیں بھی ایک عرصے تک اِسی غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ لیکن ۲۰۰۷ء میں اقبال کی فکر کے زیادہ گہرے معانی میرے سامنے آئے تو اِس خط کا اصل مطلب بھی خود بخود واضح ہو گیا۔

اقبال یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ وہ اِس کتاب کو لکھتے ہی شائع بھی کروا دیں گے۔ اُن کا منصوبہ تو یہ تھا کہ کتاب کی اشاعت ایک مخصوص وقت پر ہو گی اور وہ وقت اُن کی وفات کے بعد آئے گا (ظاہر ہے کہ جو شخص آیندہ صدیوں کے واقعات سے واقفیت کا دعویٰ کر رہا ہو، اُسے کم سے کم اِتنا تو ضرور معلوم ہونا چاہیے!)۔

---

[1] مکتوب بنام گرامی یکم جولائی ۱۹۱۷ء؛ برنی، کلیات مکاتیب اقبال جلد اول، ص ۶۱۸

چنانچہ اقبال نے چند اور خطوط میں بھی اِس منصوبے کا ذکر کیا۔ مثلاً اگلے ہی برس، ۱۹۱۸ء میں، لکھا کہ ''تیسرے حصے کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ یہ ایک قسم کی نئی منطق الطیر ہو گی۔''[1] منطقُ الطیر فارسی کے عظیم شاعر شیخ فریدالدین عطار کی لکھی ہوئی ایک تصنیف ہے، جس میں پرندے اپنی منزل کی تلاش میں سات وادیوں سے گزرتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء ہی کے ایک اور خط میں اقبال نے لکھا کہ اِس کتاب پر کام عارضی طور پر رُک گیا ہے۔[2] لیکن کچھ برس بعد ۱۹۲۳ء میں لکھا کہ دل و دماغ ایک دفعہ پھر تیار ہو رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں لکھا کہ کتاب پر کام ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

اگر ہم اقبال کی بیاضوں یعنی شاعری کی نوٹ بُکوں کا جائزہ لیں تو ایک جگہ ''مثنوی حصہ سویم'' اور دوسری جگہ صرف ''حصہ سویم'' کے عنوانات کے تحت کچھ اشعار فارسی میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ پھر بیاضوں میں اُن اشعار کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور دو علیحدہ کتابیں بن جاتی ہیں۔ ایک کتاب زبورِ عجم کے عنوان سے ۱۹۲۷ء میں اور دوسری جاویدنامہ کے عنوان سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

اگرچہ اقبال نے اِن کتابوں کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ یہ مستقبل کی تاریخیں ہیں لیکن دونوں کتابوں کے بارے میں ایسے واضح دعوے ضرور کر دیئے جن سے قارئین یہ مطلب نکال سکتے تھے۔ اِس لیے سمجھا جا سکتا ہے کہ اقبال نے اپنے پہلے خط میں جو لکھا تھا کہ مستقبل کی تاریخ کی اشاعت تب ہو گی ''جب اُس کا وقت آئے گا''، اُس سے مراد تھی کہ جب قارئین اُن کے دعوؤں کو قبول کر کے اُن پر غور کرنے کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ تب یہ دونوں کتابیں ''مستقبل کی تاریخ'' بن جائیں گی۔ اُس وقت تک یہ صرف

---

[1] مکتوب بنام مہاراجہ کشن پرشاد یکم فروری ۱۹۱۸ء؛ برنی، کلیات مکاتیب اقبال جلد اول، ص ۷۰۱

[2] مکتوب بنام اکبر الٰہ آبادی ۲۲ نومبر ۱۹۱۸ء؛ برنی، کلیات مکاتیب اقبال جلد اول، ص ۷۸۴

زبورِ عجم اور جاوید نامہ ہی رہیں گی۔

*

سرگزشتِ آدم کتابوں کی ایک ایسی سیریز سے تعلق رکھتی ہے جس میں تمام انسانی علوم کو اقبال کے بنائے ہوئے خاکے کے مطابق پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ خاکہ یہ ہے:

- تاریخ کو ہم ماضی کے واقعات کا ریکارڈ سمجھتے رہے ہیں لیکن اقبال کے لحاظ سے یہ قدرت کی ایک قوّت کا اظہار ہے جو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ اِس کے اب تک کے سفر کو دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱ قدیم زمانہ جب خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی نے انسانیت کی تربیت کر کے اُسے اُس مقام تک پہنچایا جہاں وہ کسی نئی وحی کے بغیر پہلے سے موجود رہنمائی کی روشنی میں اپنے سفر کو خود ہی جاری رکھ سکے۔ یہ زمانہ سات ادوار پر مشتمل تھا اور اسلام کے ظہور پر ختم ہُوا۔ زیرِ نظر کتاب سرگزشتِ آدم اُنہی سات ادوار کی تاریخ ہے جو ۷۵۰ء میں بنو امیہ کے زوال پر ختم ہوتی ہے۔

۲ جدید زمانہ اسلام کے ظہور کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور جاری ہے۔ اِس زمانے میں انسانیت خدا کے تصوّر کو عملی تجربے کے ذریعے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے، جس کے پانچ ادوار کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ہم اُن میں سے تیسرے دَور میں ہیں۔ اِس لیے اگر ہم اب تک کے سفر کو سمجھ لیں تو آنے والے دو اَدوار

بھی ہم پر واضح ہو جاتے ہیں جو کئی صدیوں پر محیط ہوں گے۔
چنانچہ ۱۷۵۰ء سے لے کر آیندہ کچھ صدیوں تک کی تاریخ اِس سلسلے کی اگلی کتاب حضرتِ انسان میں پیش کی جا رہی ہے۔

- ادبیات اور فنونِ لطیفہ کا اصل کام ایسے آئیڈیل ہمارے سامنے پیش کرنا ہے جو ہمیں تاریخ کے مقاصد سے بھی آگاہ کریں اور آنے والے خطرات سے بچنے کا طریقہ بھی بتائیں۔
- سیاسیات صرف کسی ایسے آئیڈیل کو حقیقت کا رُوپ دے سکتی ہیں جسے ایک معاشرے نے پہلے سے اپنے ادبیات اور فنونِ لطیفہ کے ذریعے اپنا لیا ہو، خواہ وہ آئیڈیل اچھا ہو یا برا!
- مذہبی اور سائنسی فکر کا کام یہ ہے کہ جب سیاسی عمل کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی آئے تو مذہبی اور سائنسی فکر اُس کی تشریح کرے اور نئے پیدا ہونے والے امکانات سے فائدہ اُٹھانے کے طریقے بتائے (واضح رہے کہ یہاں "مذہبی فکر" سے مذہب کے بارے میں انسانی سوچ بچار مراد ہے نہ کہ خود مذہب، جو زمانے کی تبدیلیوں سے بے نیاز ہوتا ہے)۔
- ایک معاشرے کے اِس تمام تجربے کو اگلی نسل تک منتقل کرنے کا نام تعلیم ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو فی الحال دنیا میں تعلیم موجود ہی نہیں ہے۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ایک نئی سوشل سائنسز (سماجی علوم) ہیں۔ چونکہ یہ علوم اقبال کے اُستوار کیے ہُوئے اُصولوں کی بنیاد پر حاصل کیے جا رہے ہیں اِس لیے انہیں "اقبال سائنسز" بھی کہا جا سکتا ہے۔

کسی بھی نئے علم کی طرح یہ علوم بھی تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں انکساری کے ساتھ

ایک طالبِ علم کے طور پر حاصل کیا جائے۔ جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کے پاس پہلے سے جو بھی علم موجود ہے، اُسے اپنے ذہن سے نکال کر آغاز کیجیے۔ آپ نے پہلے سے اقبال کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا ہے یا دُوسرے علوم جو آپ کو پہلے سے حاصل ہیں، وہ اِس نئے علم کو سمجھنے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

*

اب اِس کتاب کے بارے میں بعض وضاحتیں سن لیجیے۔

اِس کتاب میں صرف قدیم زمانے کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ یہ انسان کی تربیت کا زمانہ تھا جو آخری نبیؐ کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اقبال نے جاویدنامہ میں اِس زمانے کو سات ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہم نے بھی اِسی لحاظ سے سات ابواب بنائے ہیں:

۱ جستجو کا مرحلہ ("باب ۱: انسان زمین پر"): انسان کے سامنے سب سے پہلے یہ مسئلہ تھا کہ مشکل ترین قدرتی حالات میں زندہ کیسے رہے۔ ظاہر ہے کہ اِس کے لیے انسان نے پتھر سے اوزار بنائے، آگ جلانا سیکھی اور غاروں میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ اپنایا۔ لیکن اِن تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو بھی پہچان رہا تھا اور خدا کو بھی! موجودہ سائنسی معلومات تجویز کرتی ہیں کہ یہ مرحلہ تقریباً تین لاکھ برس پہلے انسان کے ظہور کے ساتھ شروع ہُوا ہو گا۔

۲ دریافت کا مرحلہ ("باب ۲: برفانی امتحان"): ایک دو لاکھ برس میں انسان نے اپنی بقا کا مسئلہ حل کر لیا تو زندگی کے لطیف پہلوؤں کی طرف توجہ دینے کی مہلت ملی جس کے نتیجے میں فنونِ لطیفہ کی ابتدائی صورتوں کی ترقی بھی ہُوئی اور انسان نے ایک دُوسرے کے ساتھ اپنے تعلق کی مزید گہرائیوں کو بھی دریافت کیا۔

۳ ماوروائیت کا مرحلہ ("باب ۳: تہذیب کا آغاز"): آج سے تقریباً تین ہزار ایک سو برس پہلے انسانی تہذیب کا آغاز ہُوا جو صرف مادی ترقی نہیں تھی بلکہ فطرت کی عام سطح سے بلند ہونا بھی تھا۔

۴ آزادی کا مرحلہ ("باب ۴: چھوٹے ملک، بڑے عزائم"): تقریباً ۱۲۰۰ قبل مسیح سے ۵۵۹ قبل مسیح تک دنیا بھر میں چھوٹی چھوٹی قومیں اور ریاستیں بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور نمایاں کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کئی لحاظ سے یہ ایک ایسا زمانہ دکھائی دیتا ہے جب انسانیت اپنے ضمیر میں آزادی کی مختلف جہتوں کا تجربہ کر رہی تھی۔

۵ عمل کا مرحلہ ("باب ۵: وحدت کی تلاش") ۵۵۹ قبل مسیح میں سائرس اعظم کے عروج کے ساتھ ایک ایسا زمانہ شروع ہوتا ہے جب قوموں کی داخلی خود مختاری کے اصول پر بڑی بڑی سلطنتیں بنانے کا تجربہ کیا جاتا ہے اور انسان کی وحدت کم سے کم ایک آئیڈیل کے طور پر تاریخ کے صفحات پر ضرور نقش ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ساڑھے پانچ سو برس کے عرصے میں یہ آئیڈیل آہستہ آہستہ اقتدار کی ہَوَس اور بے رحم طاقت کے راج میں گم ہو جاتا ہے۔

٦ وسعت پذیری کا مرحلہ ("باب ٦: روحانی تجربے"): اگلے مرحلے پر، جسے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی آمد کے ساتھ شروع کیا جا سکتا ہے، ہمیں دنیا کے بہترین انسان بالکل اُسی زور شور کے ساتھ باطنی ترقی کی طرف متوجہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس زور شور کے ساتھ پچھلے مرحلے میں سلطنت سازی پر توجہ دی گئی تھی۔ یہ تجربہ گویا انسانیت کو تربیت کے آخری مرحلے کے لیے تیار کر دیتا ہے۔

۷ تخلیق کا مرحلہ ("باب ۷: نئی منزلیں، نئے راستے"): انسان کی تربیت کا آخری

مرحلہ خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر محیط ہے۔ اِس لیے ہم اِسے ۵۷۰ء میں آنحضورؐ کی پیدائش کے ساتھ شروع کر سکتے ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ آنحضورؐ کے وصال کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ وحی کا سلسلہ وہاں ختم ہو رہا ہے۔ ایک اور لحاظ سے ہم اِسے صحابہ ؓکرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے تک وسیع کر سکتے ہیں۔ خالص تاریخی اعتبار سے اِسے بنو امیہ کے زوال تک بھی پھیلایا جاسکتا ہے جب وہ پرانی دنیا ہر اعتبار سے فنا ہو گئی جو اسلام سے پہلے موجود تھی اور ایک نئی دنیا کی تشکیل کے لیے میدان پوری طرح صاف ہو گیا۔

یہ سات مراحل ایک روح کی ترقی کے قدرتی مراحل ہیں جن کا اطلاق زندگی کے بعض دُوسرے شعبوں پر بھی کیا جاسکتا ہے (اِس کی مثالیں آپ کو اِس سیریز کی بعض دوسری کتابوں، بالخصوص سیمرغ اور زندگی کی کتاب میں نظر آئیں گی)۔ بہرحال یہاں قدیم زمانے کی تاریخ کو اِن مراحل کی روشنی میں دیکھا جارہا ہے اور تفصیل آپ اِس کتاب میں پڑھنے جارہے ہیں۔

اِس کتاب کو لکھتے ہوئے پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہ آپ کو دلچسپ معلوم ہو۔ لیکن بہرحال یہ تاریخ کی کتاب ہے اِس لیے ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات اور شخصیات کے نام آپ کے لیے غیر مانوس ہوں۔ اُس صورت میں یاد رکھیے گا کہ یہ کتاب ایک دفعہ پڑھنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ ایک نئے علم کی بنیاد ہے اور بار بار پڑھے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ کوئی حرج نہ ہو گا اگر آپ اِسے کئی مختلف انداز میں پڑھ کر دیکھیں، مثلاً پہلی دفعہ صرف وہ حصے پڑھ جایئے جو آپ کو دلچسپ معلوم ہوں اور بعد میں پوری کتاب شروع سے آخر تک بھی پڑھ لیجیے!

جہاں تک حوالہ جات اور حاشیوں کا تعلق ہے، وہ صرف اقبال کے براہِ راست

اقتباسات کے لیے دیے گئے ہیں۔ یہ کسی علمی معیار کی خلاف ورزی نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ایسی عالمی تاریخ میں ہر سطر کے لیے الگ ماخذ درکار ہوتا جس سے متن بوجھل اور ناقابلِ مطالعہ ہو جاتا جبکہ قاری کو اس کا کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا۔ پچھلے سوڈیڑھ سو سال میں عالمی تاریخ پر لکھی جانے والی اہم کتابوں، مثلاً اوسوالڈ اشپینگلر، ایچ جی ویلز، کارل یاسپرس اور یووال نوح حراری کی تصانیف میں بھی ایسے تفصیلی حوالہ جات کا رواج نہیں۔ موجودہ دور میں تو قارئین انٹرنیٹ اور مصنوعی ذہانت جیسے ذرائع کی مدد سے خود ہی تاریخی حقائق کی تصدیق بآسانی کر سکتے ہیں۔ ایسا ضرور کیجیے۔ چونکہ اِس کتاب کا بنیادی دعویٰ اقبال کے زاویۂ فکر سے ہم آہنگی پر مبنی ہے اس لیے حوالہ جات کو صرف اُن مواقع تک محدود رکھا گیا ہے جہاں اقبال کے الفاظ براہِ راست نقل کیے گئے ہیں۔

اِملا کے حوالے سے عرض ہے کہ اُردو میں بعض الفاظ کے ایک سے زیادہ اِملا رائج ہیں جو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک زندہ زبان اِس مرحلے سے بھی گزرتی ہے (آج سے تین سو برس پہلے انگریزی بھی اِسی مرحلے سے گزر رہی تھی)۔ میں نے ایسی صورتوں میں زیادہ آسان اِملا کو ترجیح دی ہے بشرطیکہ وہ لسانیات کے اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

*

اِس سیریز کی دُوسری کتابوں کی طرح اِس کتاب کی پیشکش کے لیے بھی مَیں الہجرہ سکولز ٹرسٹ اور اُس کے بانی عبدالکریم ثاقب صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہُوں، جنہوں نے اِس سیریز کے لکھے جانے پر اِصرار کیا۔ جیسا کہ مَیں دُوسری کتابوں میں بھی ذکر کر چُکا ہوں، اِس ٹرسٹ کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے ذریعے اسلام کے معاشرتی اصولوں پر مبنی معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کرنا ہے۔ اِس ادارے کے تحت چلنے والے اسکول کے

سابق طالبِ علم اسرار احمد کی معاونت کے لیے مَیں اُن کا بھی شکر گزار ہُوں۔

*

آخر میں یہ ضرور یاد رکھیے کہ اقبال کا مقصد سنسنی خیز پیش گوئیاں کرنا نہیں تھا۔ وہ تاریخ اور زندگی کے دوسرے شعبوں کو سائنسی بنیادوں پر دیکھنے کے اصول پیش کر رہے تھے۔ شاید اِسی لیے اُنہوں نے اِسے ایک نازک مضمون قرار دیا تھا کیونکہ سائنسی پیش بینی کسی قسم کی توہم پرستی، تقدیر پرستی یا اندھی عقیدتمندی کے جذبے کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ اِس کے لیے جاگتے ہوئے دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے اور ٹھوس معلومات پر گرفت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ خدا کرے کہ ہمیں وہ جاگتے ہوئے دل و دماغ نصیب ہوں کیونکہ اب ہم اُس دَور میں داخل ہو چکے ہیں جہاں مستقبل کی پیش بینی صرف شوق کی چیز نہیں رہی بلکہ ایک ذمہ داری بنتی جا رہی ہے:

خلوَت کی گھڑی گزری، جلوَت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

یہ کتاب اپریل ۲۰۲۵ء میں لکھی جا چکی تھی لیکن ایک برس کی تاخیر سے اپریل ۲۰۲۶ء میں شائع ہو رہی ہے۔

خرّم علی شفیق

۷/اپریل ۲۰۲۶ء

باب ۱

انسان زمین پر

سائنسدانوں کے مطابق کائنات کا آغاز تقریباً چودہ ارب سال پہلے ایک عظیم دھماکے (Big Bang) سے ہُوا، زمین کی تشکیل تقریباً ساڑھے چار ارب سال پہلے ہوئی، زمین پر زندگی کا آغاز تقریباً ساڑھے تین ارب سال پہلے ہُوا اور پھر تقریباً تین لاکھ سال پہلے انسان یعنی ہوموسیپئینز (Homo sapiens) کا ظہور ہُوا۔

یہ تمام باتیں تحقیق سے معلوم ہوئی ہیں اور اِن کے ٹھوس ثبوت بھی موجود ہیں۔ لیکن اِس سے آگے بڑھ کر موجودہ سائنس یہ نظریہ بھی پیش کرتی ہے کہ زندگی کی شکلیں ارتقائی مراحل سے گزرتی رہیں اور بالآخر اُنہی میں سے ایک شکل انسان کہلائی۔ اِس دعوے کا کوئی ٹھوس ثبوت اب تک سامنے نہیں آسکا ہے بلکہ الگ الگ شواہد کو آپس میں جوڑ کر یہ مفروضہ برآمد کیا جاتا ہے۔[1] اِس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہوسکتا ہے کہ اِنسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن شریف کی تعلیمات کو عام مسلمان جس طرح سمجھتے آئے ہیں، اُسی پر قائم رہا جائے:

خِردمندوں سے کیا پُوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے

[1] سائنس دانوں کے پیش کردہ شواہد سے مراد فوسلز، جینیاتی مشابہت اور انواع میں تبدیلی کے مشاہدات ہیں۔

کہ مَیں اِس فکر میں رہتا ہُوں، میری انتہا کیا ہے[1]

حضرت آدم علیہ السلام

قرآن کے مطابق خدا نے فرشتوں سے کہا کہ وہ زمین پر اپنا نائب بنائے گا۔ فرشتوں نے کہا کہ وہ بہت خونریزی کرے گا تو خدا نے جواب دیا، "جو میں جانتا ہُوں وہ تم نہیں جانتے۔" اُس کے بعد خدا نے آدمؑ کو تخلیق کر کے اُنہیں تمام اشیا[2] کے نام سکھا دیئے۔ فرشتوں کے سامنے وہ تمام چیزیں رکھی گئیں تو وہ نام نہ بتا سکے لیکن آدمؑ نے بتا دیئے۔ تب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔

فرشتوں نے تو سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ وہ فرشتہ نہیں تھا بلکہ اُسے خدا نے آگ سے پیدا کیا تھا لیکن وہ بھی فرشتوں کے ساتھ موجود تھا۔ اُس نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ خدا نے اُسے آگ سے پیدا کیا ہے اور انسان کو مٹی سے، اِس لیے وہ انسان سے برتر ہے۔ وہ اپنے مقام سے گر گیا اور اُس نے کہا کہ وہ آدمؑ کی اولاد کو گمراہ کرتا رہے گا۔

اُس کے بعد خدا نے آدمؑ اور اُن کی بیوی سے کہا کہ وہ جنت میں آرام سے رہیں اور جو چاہیں کھائیں، لیکن ایک خاص درخت کے قریب نہ جائیں۔ ساتھ ہی ابلیس سے ہوشیار

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۸۱

[2] یہ لفظ "اشیاء" اور "اشیا" دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ یہاں مؤخر الذکر املا کو ترجیح دی گئی ہے کیونکہ اُردو میں اِسی لفظ کا اسم واحد "شے" ہے (یعنی "ء" کے بغیر)۔ عربی میں واحد اور جمع دونوں صورتوں میں "ء" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اُردو میں چونکہ واحد لفظ سے "ء" خارج کر دیا گیا ہے اِس لیے جمع میں اِسے برقرار رکھنے سے اسم واحد اور اسم جمع کے درمیان ربط کمزور ہو جاتا ہے۔

رہنے کی تنبیہ بھی کر دی۔ لیکن وہ دونوں ابلیس کے بہکاوے میں آکر اُس درخت کے قریب چلے گئے۔ خدا نے اُنہیں جنت سے نکلنے کا حکم دیتے ہوئے کہا، "تم میں سے بعض بعضوں کے مخالف ہوں گے۔ زمین میں تمہارے لیے ایک خاص مدت تک ٹھہرنے کی جگہ اور زندگی گزارنے کا سامان ہو گا۔" جب ابلیس نے خدا کی نافرمانی کی تھی تو معافی مانگنے کے بجائے اپنی نافرمانی کا جواز پیش کیا تھا۔ لیکن آدمؑ اور اُن کی بیوی نے سچے دل سے توبہ کی اور خدا سے کہا، "اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم بڑے گھاٹے میں رہیں گے۔"

خدا نے توبہ قبول کرتے ہوئے کہا، "اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہی دوزخ والے ہیں۔ وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔"[1]

اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو ہدایت بھیجی جانے والی تھی اُس کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ "بعض بعضوں کے مخالف" نہ رہیں۔ خدا نے انسان کو زمین پر اپنا نائب یعنی خلیفہ بنانا تھا۔ ایک بادشاہ کے نائب کے پاس بادشاہ کی مرضی اور اجازت سے ایک محدود پیمانے پر بادشاہ ہی کی قوت ہوتی ہے۔ اُس کے بغیر وہ بادشاہ کے نائب ہونے کا فرض ادا نہیں کر سکتا۔ خدا نے اپنی شان اِس طرح بیان فرمائی ہے کہ "جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے، 'ہو جا!' اور وہ ہو جاتی ہے" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۱۷)۔ چنانچہ خدا نے اپنی مرضی سے ایک محدود پیمانے پر یہی قوّت انسان میں رکھی تھی، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

---

[1] سورۂ بقرہ، آیات ۳۹-۳۰

تُو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا[1]

فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا بھی گویا اِسی بات کی علامت تھا کہ قدرت کی تمام قوّتیں انسان کی مرضی کی پابند کر دی گئی ہیں کیونکہ فرشتے خدا کے حکم سے کائنات کی مختلف قوّتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ لیکن چونکہ "کُن فیکون" کی یہ طاقت (جسے اقبال "رازِ کن فکاں" کہتے ہیں)، ہر انسان میں رکھی گئی ہے اِس لیے یہ قوّت اُس وقت موئثر ہو سکتی ہے جب لوگ مل کر اپنے اپنے ارادوں کو متحد کر لیں۔ ورنہ ہر انسان میں رکھی گئی قوّت دوسرے انسان کو دی ہوئی قوّت سے ٹکرا کر زائل ہوتی رہے گی۔

طرح طرح کے انسانوں کے لیے اتفاقِ رائے کو اپنی فطرت کا حصہ بنا لینا کوئی ایسی بات نہیں جو ایک آدھ دن میں سکھائی جا سکے بلکہ اِس کے لیے ایک تجرباتی عمل سے گزرنے کی ضرورت بھی ہے۔ چنانچہ تاریخ دراصل اِسی کہانی کا نام ہے کہ کس طرح ایک زمانے میں خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی نے اِس سلسلے میں انسان کی تربیت کی اور کس طرح انسان اُس تربیت کے نتیجے میں اب خود اُس منزل کی طرف بڑھا جا رہا ہے:

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اُخُوّت کی جہاں گیری، محبّت کی فراوانی![2]

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۱۱

[2] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۰۷

اِنسان کیا ہے؟

اقبال کے لحاظ سے اِس قصے اور قرآن و حدیث کے دوسرے بیانات کی روشنی میں انسان کی فطرت کے بارے میں چار اُصول معلوم ہوتے ہیں:

۱ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ عام طور پر انسانی شخصیت کے تین بنیادی پہلو قرار دیئے گئے ہیں: ارادہ (will)، جس سے مراد یہ ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؛ عقل (intellect)، جس کا تعلق سوچ، سمجھ، علم اور خیالات سے ہے؛ اور محسوسات (feelings)، جن کا تعلق اِس بات سے ہے کہ ہم کیا محسوس کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک حضرت آدمؑ کے قرآنی قصے سے ظاہر ہے کہ عقل اور محسوسات کی نسبت اِرادہ زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی مرضی یا ارادہ کتنا اہم ہے۔ چنانچہ انسان کی اصل فطرت اُس کے ارادے میں مضمر ہے نہ کہ عقل اور سمجھ میں! یعنی ایک انسان کی نیت اور ارادہ اُس کی عقل، سمجھ، علم اور محسوسات سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

۲ یہ نیت اور اِرادہ قدرتی طور پر برائی کی بجائے اچھائی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان قدرتی طور پر نیک ہے۔

۳ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جب انسان فطرتاً نیک ہے تو پھر دنیا میں برائی کیوں ہے؟ اقبال جواب دیتے ہیں کہ دنیا کی تمام برائیاں اصل میں کسی نہ کسی خوف کی وجہ سے ہیں۔ اور خوف ہمیشہ دو چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے: اول، خدا کی ذات پر مکمل یقین نہ ہونا۔ دوم، اپنے ماحول یا دوسرے انسانوں کے متعلق کوئی غلط فہمی۔

۴ اِسی سے چوتھا بنیادی اُصول بھی بر آمد ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے جو غربت اور نا انصافی سے پاک ہو۔ چونکہ برائی انسان کی فطرت میں شامل نہیں ہے اور صرف خوف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اِس لیے اگر معاشرے سے خوف کو دُور کر دیا جائے تو تمام برائیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ خدا کی طرف سے جو رہنمائی پیغمبروں کے ذریعے ہمیں ملتی رہی ہے، اُس کا ایک مقصد یہ بھی رہا ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اِس دنیا میں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔[1]

حقیقت میں مغرب کی جدید زندگی کی بنیاد بھی اُس وقت پڑی جب آج سے تقریباً تین سو برس پہلے مغرب نے اِنسان کے اِسی تصوّر کو اپنایا۔ اِس بات کو بالکل آسان اور مختصر طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اِنسان کے بارے میں تین بنیادی تصوّرات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

آج سے تقریباً چار سو برس پہلے انگلستان میں ایک بڑا سیاسی فلسفی گزرا ہے جس کا نام ٹامس ہوبز (Thomas Hobbes; 1588 –1679) تھا۔ اُس زمانے میں عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اِنسان کی اصل فطرت ارادے پر نہیں بلکہ محسوسات پر مشتمل ہے۔ یعنی انسان اپنے اچھے برے کا فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ محض اپنی جسمانی خواہشات کے پیچھے دوڑنے والا جانور ہے۔ ہوبز نے اِسی تصوّر کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے فرض کیا کہ جب انسانی تہذیب کا آغاز نہیں ہُوا تھا اور اِنسان قدرتی حالت (State of Nature) میں رہتے تھے تو اُن کی زندگیاں "تنہا، مفلس، تلخ، وحشیانہ اور مختصر" ہوتی

[1] یہ تمام نکات اقبال نے ۱۹۰۹ء میں اپنے مقالے 'Islam as a Moral and Political Ideal' میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مقالے کے متن کے لیے دیکھیے: Latif Ahmad Sherwani (ed.), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*

تھیں۔ تہذیب کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ کوئی طاقتور شخص تمام انسانوں پر حکومت کر کے اُنہیں ایک دُوسرے سے بچا سکے۔ یورپ اور بالخصوص انگلستان میں اِس نظریے نے مطلق العنان بادشاہت اور شخصی حکومت کو فروغ دیا۔ انسان کے بارے میں اِس قسم کے تصوّر کا نتیجہ اِس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے؟

اِس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے ایک اور انگریز فلسفی جان لاک (John Locke; 1632 – 1704) نے تجویز کیا کہ انسان کی اصل فطرت محسوسات پر نہیں بلکہ عقل پر مشتمل ہے۔ اِس لیے جب انسان قدرتی حالت میں رہتے تھے، تب بھی اُن میں باشعور ہونے کی تڑپ موجود تھی اور اِسی تڑپ نے تہذیب کو جنم دیا۔ اِس نظریے نے یورپ اور بالخصوص انگلستان میں اُس محدود قسم کی جمہوریت کی بنیاد رکھی جس میں عوام چار پانچ سال میں ایک دفعہ ووٹ دے کر حکومت کسی ایسی جماعت یا شخص کے حوالے کر دیتے ہیں جس کا پروگرام اُنہیں پسند آتا ہے۔

اِن دونوں صورتوں کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی آواز فرانسیسی مفکر ژاں ژاک رُوسو (Jean-Jacques Rousseau; 1712 – 1778) نے بلند کی۔ علامہ اقبال نے اُسے مغرب کی جدید سیاسی فکر کا حقیقی بانی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اُس نے انسان کا وہی تصوّر یورپ کے سامنے پیش کیا جو اِسلام کے لحاظ سے بھی درست ہے۔[1]

رُوسو نے کہا کہ انسان کی اصل فطرت ارادے میں مضمر ہے، انسان فطرتاً نیک ہے، تمام برائیوں کی جڑ خوف ہے اور دنیا میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جو خوف، غربت، ناانصافی اور ظلم سے پاک ہو۔

Latif Ahmad Sherwani (ed.), 'Islam as a Moral and Political Ideal';[1] *Speeches, Writings and Statements of Iqbal,* p.90

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ وہی تصوّر ہے جسے ابھی ابھی آپ نے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت آدمؑ کے قرآنی واقعے کی مدد سے سمجھا ہے۔ اِس تصوّر کی بنیاد پر رُوسو نے کہا، ''اپنی ابتدائی حالت میں انسان سے زیادہ نرم خُو کوئی چیز نہیں!'' اُس نے انسان کی قدرتی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا، ''وحشی انسان جنگلوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ نہ کوئی صنعت، نہ بول چال، نہ رہنے کی جگہ، نہ جنگ، نہ کوئی تعلق! نہ کوئی محتاجی تھی، نہ کوئی خوف!'' رُوسو کے اِس تصوّر کو بعض اوقات ''شریف وحشی'' (noble savage) بھی کہا جاتا ہے۔

یہی نظریات تھے جنھوں نے ایک سچی اور حقیقی جمہوریت کی تلاش کے عمل کا آغاز کرتے ہوئے مغرب کی جدید تہذیب کے مثبت پہلوؤں کی بنیاد رکھی۔ نتیجے میں انسانی حقوق، آزادی، مساوات اور اخوّت کے تصوّرات اِس حد تک مقبول ہوئے کہ آج دنیا کی اکثر قومیں اِنہیں اپنانے کی کوشش کرتی ہیں۔

اِس لیے اب اگر ہم اِنسان کے اِس تصوّر کے بجائے کسی دُوسرے تصوّر کو قبول کر کے اُس کے مطابق انسانی تاریخ بیان کریں گے تو صرف ایک مسلمان کا ایمان ہی نہیں بلکہ دنیا میں رائج یہ اُصول بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اور غور کیا جائے تو یہ سب خطرے میں پڑ چکے ہیں۔ وجہ شاید یہی ہے کہ بڑی مدّت سے سائنس دان اور محقق اِس انداز میں دنیا کی تاریخ لکھوا رہے ہیں جو اِن اصولوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

بات یہ ہے کہ پرانے زمانے کے لوگوں کی اپنی لکھی ہوئی تاریخیں دو ڈھائی ہزار سال سے زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ اُس سے زیادہ پیچھے جائیں تو صرف اشارے ہی اشارے ہیں۔ کسی قبر سے پرانے زمانے کے انسان کی ہڈیاں برآمد ہو گئیں، کہیں کھدائی سے کوئی ٹوٹا ہُوا مٹی کا برتن نکل آیا، کسی ٹیلے کے اندر کسی پرانے شہر کے کچھ آثار مل گئے، کہیں سے مٹی

کی تختیوں پر لکھی ہوئی کہانی مل گئی اور کہیں سے کچھ اور:

آگ بُجھی ہُوئی اِدھر، ٹُوٹی ہُوئی طناب اُدھر
کیا خبر اِس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں![1]

یہ ٹوٹے پھوٹے اشارے خود تو نہیں بتا سکتے کہ اِنہیں کس طرح جوڑ کر انسان کی پوری کہانی ترتیب دی جائے اور اُس کہانی کی جو کڑیاں ابھی تک دریافت نہیں ہوئی ہیں اُن کی جگہ پر کیا رکھا جائے! یہ سب کچھ تو ماہرین کو خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ انسان اور اُس کی تاریخ کے بارے میں جو بھی نظریہ رکھتے ہیں، اُسی کے مطابق اِن اشاروں کو جوڑ کر ایک تاریخ بنا لیتے ہیں۔ اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ "مستند تاریخ" ہے کیونکہ اِس میں آثارِ قدیمہ سے برآمد ہونے والے نوادرات کا تذکرہ بھی موجود ہے اور جدید سائنسی تحقیق کے حوالے بھی دے دیئے گئے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور موجود علوم انسان کے جس تصوّر کو فروغ دے رہے ہیں وہ ہوبز کے پیش کیے ہوئے جبلتوں کے غلام جانور کا تصوّر ہے۔ اِس لیے پچھلے سو برس میں دنیا کی تاریخ کے بارے میں جتنی بھی کتابیں سامنے آئی ہیں، وہ اِسی غلط اور تباہ کن بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔ بعض مصنفوں نے زیادہ سے زیادہ اِتنی جرأت دکھائی ہے کہ ہوبز کے بجائے لاک کے شعور پرست انسان کو ذہن میں رکھ کر تاریخ لکھ ڈالی ہے۔ لیکن گزشتہ ایک صدی میں کوئی ایک بھی عالمی تاریخ ایسی نہیں لکھی گئی جو انسان کے اُس تصور پر مبنی ہو جسے رُوسو نے پیش کیا تھا، یا جسے اقبال نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بیان کیا۔ نہ مسلمانوں نے اسلام کی خاطر ایسی کوئی کوشش کی، نہ اقبال کے چاہنے والوں نے اقبال

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۵۲

کے پیغام کی خاطر، اور نہ ہی مغرب کے کسی مفکر یا دانشور نے اپنی بکھرتی ہوئی تہذیب کو بچانے کے لیے ایسا کیا، جو آج اپنی بقا کی آخری لکیر پر کھڑی ہے۔

لہٰذا یہ کتاب صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ اُن تمام لوگوں کے لیے بھی ہے جو انسانی حقوق، مساوات، آزادی اور اخوّت جیسے عظیم تصورات کو بچانا چاہتے ہیں۔ یا ہم اِس کتاب میں پیش کیے گئے نظریۂ تاریخ کو اپنائیں یا اِن نعمتوں سے محروم ہونے کے لیے تیار ہو جائیں:

تُو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں[1]

انسان کی ابتدائی زندگی

انسان تقریباً تین لاکھ سال پہلے اس زمین پر نمودار ہوا۔ ابتدائی ایک لاکھ نوے ہزار سال تک وہ شکار کرنے اور جنگل سے خوراک جمع کرنے والے گروہوں کی صورت میں زندگی گزارتا رہا۔ اس طویل عرصے کو ”پتھروں کا قدیم دَور“ (Old Stone Age) یا ”پیلیئیو لتھک عہد“ (Palaeolithic Age) کہا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا زمانہ تھا جب ترقی بہت آہستہ ہوئی، مگر اس کے اثرات گہرے تھے۔ اُس دور میں اوزار بنانے، بات چیت کرنے اور زندہ رہنے کے ہنر میں اہم پیش رفت ہوئی۔ رفتہ رفتہ انسانوں نے اوزار بہتر بنائے، بول چال کے طریقے اپنائے اور سماجی طور پر ساتھ جینے کے اصول سیکھے۔ اُن کی بقا کا انحصار فطرت کو گہرائی سے سمجھنے پر تھا۔ وہ شکار کرتے،

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص ۱۸۰

پودے جمع کرتے اور خوراک یا تحفظ کی تلاش میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف ہجرت کرتے۔

اِس دور کی چند اہم کامیابیوں میں پتھروں سے اوزار بنانا، آگ کا استعمال سیکھنا اور زبان کی ابتدا کرنا شامل ہیں۔ آگ سے انسان کھانا پکا سکتے تھے، سردی سے بچ سکتے تھے اور درندوں سے محفوظ رہتے تھے۔ وقت کے ساتھ شاید انہوں نے آرٹ یا علامتی اظہار کی بھی ابتدا کی ہو اگرچہ اس دور کے شواہد ابھی مکمل طور پر واضح نہیں۔

انسان جتنے ہوشیار تھے اُنہیں درپیش خطرات بھی اُتنے ہی سنگین تھے، جیسے موسم کی تبدیلی، خوراک کی کمی اور دوسرے جانداروں سے مقابلہ! اِن خطرات پر قابو پانے کی جدوجہد نے انسانی زندگی کو ترقی دی لیکن اُس ابتدائی زمانے کے انسان کی زندگی میں صرف یہی سب کچھ نہیں تھا۔ اِس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جس کا سراغ لگانے میں ہمارے دَور کے ماہرین عموماً ناکام رہتے ہیں۔

وِشوامتر

ہمارے زمانے کے سائنس دان، ماہرینِ بشریات اور مؤرخین عام طور پر یہ مفروضہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کا اولین مذہب شرک تھا یعنی شروع میں انسان ایک سے زیادہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتا تھا۔ اُس کے مقابلے میں توحید کا تصوّر بہت بعد میں اُبھرا۔ مگر یہ نظریہ کسی ٹھوس سائنسی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اُن پرانے تصوّرات پر قائم ہے جو انسان کو یا توجبلّت کا غلام سمجھتے ہیں (ہوبز کا نظریہ) یا محض عقل کی قوت سے چلنے والی مخلوق (لاک کا تصوّر)۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نہ صرف اسلام نے اِن دونوں نظریات کو

مسترد کر دیا تھا بلکہ خود جدید تہذیب بھی اِنہیں مسترد کرنے کے بعد ہی وجود میں آئی ہے۔ اسلام اور جدید تہذیب، دونوں کے مطابق جو چیز انسان کو انسان بناتی ہے، وہ اُس کا ارادہ ہے یعنی اچھائی یا برائی کو اپنی ذمہ داری پر منتخب کرنے کا اختیار!

یہ نقطۂ نظر تسلیم کرتے ہی ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اولین تجربات صرف زندہ رہنے کی کوشش یا عقل اور شعور کی پرورش تک محدود نہیں تھے۔ انسان کو انسان کے رُوپ میں آتے ہی اخلاقی انتخاب کی ذمہ داری کا احساس ہُوا ہو گا۔ چاہے کوئی یہ سمجھے کہ انسان کو خدا نے تخلیق کیا ہے (جیسا کہ ہم اپنے مذہب کی بنیاد پر سمجھتے ہیں)، چاہے کوئی یہ سمجھنا چاہے کہ انسان کسی ارتقائی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں (جیسا کہ سائنس دان سمجھنا چاہتے ہیں)، بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے انسان بنتے ہی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ "میں کچھ اور بھی کر سکتا تھا۔"

اِس احساس کے ساتھ ہی ذہن میں لازماً یہ خیال آیا ہو گا کہ "اگر دُوسری مخلوقات کے برعکس میرے پاس اپنی مرضی ہے، تو کیا کوئی عظیم تر مرضی بھی موجود ہے جو میری مرضی پر غالب ہو؟" اور یوں خدائے واحد کے وجود کا احساس اور اُس کی جستجو انسان کی زمینی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ جیسا کہ روسو کہتا ہے، "انسان کی روحانیت اُس کی آزادی کے شعور میں جلوہ گر ہوتی ہے۔" اور اقبال کی ایک مشہور اُردو نظم میں "روحِ ارضی" یعنی زمینی زندگی آدم کا استقبال اِن الفاظ کے ساتھ کرتی ہے:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سُورج کو ذرا دیکھ
اُس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھُپا دیکھ
ایّامِ جُدائی کے سِتم دیکھ، جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ[1]!

*

اقبال کی فارسی تصنیف جاوید نامہ میں مولانا روم کی روح اقبال کو کائنات کے سفر پر لے کر نکلتی ہے۔ پہلے باب میں اقبال چاند پر سات تجربات سے گزرتے ہیں جو اُن سات مراحل کی علامت ہیں جن سے انسانیت مجموعی طور پر تاریخ کے قدیم زمانے میں گزری تھی۔ اُن میں سے پہلا تجربہ ایک غار میں پیش آتا ہے جہاں ایک قدیم ہندو رِشی وِشوامِتر مراقبے میں مشغول ہیں۔

روایتی طور پر ہندومت کی مقدس کتب ویدوں کی بہت سی دعائیں اور مناجات وِشوامتر سے منسوب ہیں۔ اِس بات میں اختلاف موجود ہے کہ وِشوامتر سچ مچ وجود رکھتے تھے یا نہیں، لیکن جو محققین اُنہیں ایک تاریخی شخصیت مانتے ہیں، وہ اُن کا زمانہ ایک ہزار قبل مسیح سے کچھ صدیاں پہلے یا کچھ صدیاں بعد بتاتے ہیں۔ اگرچہ یہ پتھر کے دَور سے بہت بعد کا زمانہ ہے، پھر بھی جاویدنامہ میں وِشوامتر سے انسانی تاریخ کا آغاز کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگرچہ ہندو مذہب کے مقدس متون بعد میں تحریری صورت میں مرتب ہوئے لیکن اُن میں موجود عقائد، رسومات اور خیالات کا ماخذ بہت قدیم ہے۔ اُنہی قدیم ترین عقائد کے نمایندے کے طور پر وِشوامتر جاویدنامہ میں قدیم تاریخ کے پہلے دَور کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

اِس طرح اقبال گویا ہمیں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ جب انسان نے زمین پر زندگی کا آغاز

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۷۸

کیا ہو گا تو اُسے صرف پیٹ بھرنے کی فکر ہی نہیں رہی ہو گی۔ بلکہ اُس کے ذہن میں وہ سوالات بھی اُبھرے ہوں گے جو جاویدنامہ میں چاند کے اِس غار میں وشوامتر علامہ اقبال اور مولانا روم سے پوچھتے ہیں: "دنیا کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ خدا کون ہے؟"

چیست عالم؟ چیست آدم؟ چیست حق؟[1]

جواب میں اُس ابتدائی زمانے کے انسان کے ضمیر نے بھی وہی کہا ہو گا جو جاویدنامہ میں وشوامتر کہتے ہیں: "دنیا ہمیں خدا کو پہچاننے سے نہیں روک سکتی، جس طرح پانی کی سطح پر بنی ہوئی تصویر ہمیں پانی میں غوطہ لگانے سے نہیں روک سکتی!"[2]

اِس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پتھر کا زمانہ اپنے آپ کو پہچاننے کا سفر بھی تھا۔ زندگی کے وسائل پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خدا سے قربت حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رہی۔ بعد کے چند ہزار برس میں تہذیب نے جس حیرت انگیز رفتار کے ساتھ ترقی کی، اُس میں اِس گہری نشوونما کا حصہ بھی سمجھنا چاہیے جو پتھر کے طویل زمانے میں انسان کی روح میں ہُوئی۔ اِس لحاظ سے ہمیں پتھر کے زمانے کے اُن غاروں کے متعلق بھی اپنے تصوّرات بدلنے کی ضرورت ہے جہاں ابتدائی انسان بستے تھے۔ اُن غاروں میں صرف کچا گوشت نہیں کھایا جاتا تھا۔ بلکہ اُن غاروں کی فضا میں خدا، آخرت اور زندگی کی گہرائیوں کے بارے میں غور و فکر بھی کیا گیا ہو گا:

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا　　مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا　　داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تُو

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۳۵

[2] اقبال، جاویدنامہ، ص ۳۸

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو[1]

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۶

باب ۲

برفانی امتحان

زمین کی تاریخ میں کئی ایسے دور آئے ہیں جب اس کا بہت بڑا حصہ برف سے ڈھک گیا تھا۔ ایسے زمانے کو "برفانی دَور" (Ice Age) کہا جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق اب تک کم از کم پانچ بڑے برفانی دَور گزر چکے ہیں۔ ان میں سے چار اِنسان کی پیدائش سے پہلے گزرے تھے لیکن "آخری برفانی دَور" کا انسان کو سامنا کرنا پڑا۔ یہ دَور تقریباً ایک لاکھ پندرہ ہزار سال پہلے شروع ہوا اور گیارہ ہزار سات سو سال پہلے ختم ہوا۔

اِس دوران موٹی برف کی چادریں زمین کے بڑے حصوں پر پھیل گئیں اور موسم بہت سرد ہو گیا۔ اتنا زیادہ پانی برف کی صورت میں جم گیا تھا کہ سمندر کی سطح تقریباً 120 میٹر تک نیچے چلی گئی۔ اس کی وجہ سے کچھ خشکی کے پل ظاہر ہو گئے، جنہوں نے براعظموں کو آپس میں جوڑ دیا۔ مثال کے طور پر، ابتدائی انسان سائبریا سے شمالی امریکہ تک پیدل جا سکتے تھے، کیونکہ ان کے درمیان کا سمندر خشک ہو چکا تھا۔ اُس زمانے میں دنیا بالکل مختلف نظر آتی تھی — عظیم گھاس کے میدان اور جمے ہوئے مناظر شمالی نصف کرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ بہت سے بڑے جانور جیسے اون والے ہاتھی، تلوار جیسے دانتوں والے بلی نما جانور اور دیو ہیکل سست جانور اسی دور میں زندہ تھے۔ ان سخت حالات میں ابتدائی انسانوں کو زندہ رہنے کے لیے خود کو ڈھالنا پڑا۔

برفانی عہد کے انسان شکار کر کے، مچھلیاں پکڑ کر، اور پودے اکٹھے کر کے اپنی خوراک حاصل کرتے تھے۔ وہ پتھر کے اوزار بناتے، آگ سے خود کو گرم رکھتے، اور جانوروں کی کھال سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ کچھ گروہ غاروں میں رہتے تھے، اور انہوں نے وہاں خوبصورت تصویریں بنائیں۔ یہ غاروں کی تصویریں فرانس کے لاسکو اور اسپین کے آلتامیرا جیسے مقامات پر ملی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی انسان صرف زندہ رہنے میں ہی نہیں لگے تھے، بلکہ ان کے کچھ عقائد، رسومات، اور تخلیقی احساسات بھی تھے۔

تقریباً گیارہ ہزار سات سو سال پہلے دنیا گرم ہونا شروع ہوئی، اور برفانی عہد آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ برف کے پگھلنے سے سمندر کی سطح بلند ہو گئی، جس سے نشیبی علاقے زیرِ آب آ گئے اور ساحلی علاقوں کی شکل بدل گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، ایک لمحہ رُک کر سوچیں کہ انسانیت کے لیے اس لمبے برفانی دور سے، جو موجودہ معلومات کے مطابق تقریباً ایک لاکھ تین ہزار سال پر محیط تھا، زندہ بچ جانا کتنا بڑا کارنامہ ہے!

طوفان کی کہانیاں

دنیا کی قدیم تہذیبوں نے ایک تباہ کن طوفان کی کہانیاں محفوظ رکھی ہیں جن میں اکثر یہ بتایا گیا ہے کہ اس طوفان نے انسانیت کے ایک پچھلے دور کو ختم کر دیا اور چند ہی لوگ بچ پائے جنھوں نے دوبارہ زندگی کا آغاز کیا۔ کیا یہ کہانیاں برفانی دَور کی یادیں یا اُس کی علامتی تصویریں ہو سکتی ہیں؟ آیئے اِس سوال کا جواب تلاش کریں۔

ہم حضرت نوحؑ کے حالات سے واقف ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں: اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ کو حکم دیتا ہے کہ ایک عظیم کشتی بنائیں، اس میں اپنے گھر والوں اور جانوروں

کے جوڑے سوار کریں، کیونکہ ایک بڑا سیلاب زمین کو فساد سے پاک کرنے والا ہے۔ جب پانی اترتا ہے، تو کشتی ایک پہاڑ پر جا ٹھہرتی ہے، اور انسانیت ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ یہ واقعات توریت میں بھی موجود ہیں۔

لیکن اسی قسم کے واقعات دوسری تہذیبوں میں بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ''گلگامش'' نامی کہانی آج سے تین چار ہزار سال پہلے میسوپوٹیمیا (عراق) میں لکھی گئی۔ اُس میں بھی ایک بڑا سیلاب آتا ہے۔ دیوی دیوتا فیصلہ کرتے ہیں کہ زمین کو تباہ کر دیا جائے، لیکن ایک شخص ''اُتناپِشتم'' کو ایک دیوتا پہلے ہی خبردار کر دیتا ہے۔ وہ شخص ایک بڑی کشتی بناتا ہے، اپنے گھر والوں اور جانوروں کو سوار کرتا ہے، اور جب پانی اترتا ہے تو پرندے فضا میں چھوڑ کر زمین کی خشکی تلاش کرتا ہے۔

ایسی ہی ایک اور کہانی میسوپوٹیمیا کی ایک اور تہذیب کالڈیا کے آثار میں بھی ملتی ہے۔ اِسی قسم کی کہانیاں ہندو مذہب، قدیم چینی تہذیب، یونانی اساطیر، اور جنوبی امریکہ کے اِنکا قبیلے، اور ناروے اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی کہانیوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

چونکہ اُن سب کہانیوں میں ایک طوفان سے بچ نکلنے اور زندگی کو دوبارہ شروع کرنے کی بات مشترک ہے، اِس لیے بعض مغربی محققین حضرت نوحؑ کے واقعے کو ایک فرضی واقعہ قرار دینے لگے ہیں۔ وہ سمجھنے لگے ہیں کہ توریت اور قرآن نے یہ واقعہ دُوسری قوموں کی کہانیوں سے اخذ کیا ہو گا۔ اِس قسم کی تحقیق سب سے پہلے سر سید احمد خاں کے زمانے میں سامنے آئی تھی۔ سر سید نے اُس کا جائزہ لینے کے بعد بالکل صاف اور واضح الفاظ میں لکھا تھا، ''ہم اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہودیوں نے کالڈیا والوں سے طوفان کا حال لیا ہے۔ بلکہ طوفان، جس کا ذکر توریت اور قرآن مجید میں ہے، اصلی واقعہ ہے۔

فرضی اور غیر واقعی قصہ نہیں ہے۔"[1] بعد میں آنے والے مستند مفسرین بھی اِسی موٴقف پر قائم رہے ہیں۔

اِس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ قرآن شریف میں بیان کیا ہُوا حضرت نوحؑ کا واقعہ ایک سچا واقعہ ہے، ہم اصل سوال کو اِس طرح تبدیل کر سکتے ہیں کہ کیا قرآن شریف نے حضرت نوحؑ کے واقعے میں اُن اصولوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جن کی بدولت انسانیت ایک طویل برفانی دَور سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی اور اِس قسم کی دوسری قدرتی آفات سے بھی بچ سکتی ہے؟

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت آدمؑ کے بعد سب سے پہلے جس پیغمبر اور رسول کا تفصیلی ذکر قرآن شریف میں آتا ہے، وہ حضرت نوحؑ ہیں۔ اُن کے زمانے کا تعین یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔[2] البتہ قرآن کا اندازِ بیان ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے: حضرت نوحؑ کی دعوت میں وہ پیچیدگی نظر نہیں آتی جو بعد کے انبیاءؑ کی دعوت میں دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ اپنے مخالفین سے منطقی دلائل کے ساتھ بحث کرتے ہیں، حضرت موسیٰؑ جادوگروں کے مقابلے میں معجزات پیش کرتے ہیں۔ لیکن حضرت نوحؑ براہِ راست انسان

1

2 بعض محققین کی رائے ہے کہ جس طوفان کا ذکر حضرت نوحؑ کے واقعے میں آیا ہے، وہ شاید ۵۶۰۰ ق م سے ۲۰۰۰ ق م کے عرصے میں آیا ہو۔ لیکن یہ محض اندازے ہیں۔ ورنہ اُس قدیم زمانے کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات ابھی اِتنی کم ہیں کہ وثوق کے ساتھ کوئی بات کرنا مشکل ہے۔

کی نیت کو مخاطب کرتے ہیں: ”اے میری قوم! اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل پر ہوں اور اُس نے مجھے اپنی خاص رحمت عطا کی ہو جو تم پر چھپی رہ گئی ہو، تو کیا ہم تمھیں زبردستی اُسے منوانے پر مجبور کریں گے جبکہ تم نہیں چاہتے؟“(ہود:۲۸)

یہ اندازِ بیان بتاتا ہے کہ حضرت نوحؑ جن لوگوں سے مخاطب ہیں، اُن کی زندگی اور سوچ میں ابھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ اس لیے جہاں بعد کے انبیاءؑ معاشرتی اصلاح، قانون سازی اور اخلاقی ضابطوں کی بات کرتے ہیں، حضرت نوحؑ کی دعوت ایک بنیادی سچائی پر مرکوز ہے: توحید۔ ”اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو،“ وہ اپنی قوم سے کہتے ہیں۔ ”اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔“(اعراف:۵۹)۔

اسلامی فکر میں توحید کے تصوّر میں خدا کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ہم آہنگی، قوموں کے بیچ اتحاد، اور انسان اور کائنات کے ربط کے پہلو بھی موجود ہیں۔ حضرت نوحؑ کا پیغام دراصل ان سب پہلوؤں کو جوڑتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی کشتی میں نہ صرف ایمان لانے والے انسانوں کو سوار کرتے ہیں بلکہ ہر خشکی کے جانور کی ایک ایک جوڑی کو بھی ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ لہٰذا حضرت نوحؑ کے واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کا تسلسل اُس اجتماعی ارادے پر منحصر ہے جو مختلف عناصر کو ایک ساتھ جوڑ سکے:

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں[1]

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۱۹۲

*

لیکن وہ کون لوگ ہوتے ہیں جو سب سے پہلے وحدت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں؟ اکثر وہی جو معاشرے میں کمتر سمجھے جاتے ہیں مگر جن کے دل اجتماعی ارادے کی قدر جانتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کی قوم کے سردار کہتے ہیں، ”ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی اُن ہی لوگوں نے کی ہے جو ہمارے ہاں کمتر شمار ہوتے ہیں۔ ہم تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔“(ہود:۲۷)

انسان کی عزت اور سچائی کو سماجی حیثیت سے ناپنا اجتماعی ارادے کی تشکیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ سوچ بالآخر ہمیں بقا کی جبلّت سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ جب طوفان آن پہنچتا ہے، تب بھی حضرت نوحؑ کا نافرمان بیٹا کشتی میں سوار ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ پہاڑ پر چڑھ جائے گا۔ لہٰذا، اجتماعی ارادہ نہ تو مسلط کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وراثت میں ملتا ہے۔ ایک فرد صرف اپنے آزاد انتخاب کے ذریعے ہی اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ جب حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کی نجات کے لیے دعا کرتے ہیں، تو خدا فرماتا ہے: ”اے نوح! جس چیز کا تمہیں علم نہیں، اُس کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کرو۔“(ہود:۴۶)

اِس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی انسانی معاشرے جبلّت یا زبردستی سے نہیں بلکہ اجتماعی ارادوں کے ذریعے قائم ہوئے۔ اُن کی بنیاد کسی نہ کسی قسم کے عمرانی معاہدے یعنی سوشل کانٹریکٹ(social contract) پر تھی۔ اِس کی ایک مثال حضرت نوحؑ کی کشتی بھی ہے۔ وہ ایک پناہ گاہ تھی لیکن صرف اُن کے لیے جو اُس کے مقصد سے ہم آہنگ ہونے پر تیار تھے۔

لیکن اُس لمحے سے ہزاروں سال پہلے، برفانی دَور میں اور اُس سے پہلے بھی، شکار پر زندگی گزارنے والے انسانوں کے گروہ، قبیلے اور جماعتیں بھی لازماً عمرانی معاہدوں اور رضاکارانہ ہم آہنگی پر انحصار کرتی ہوں گی۔ کیونکہ بقا کا انحصار اجتماعی ارادے کی تشکیل پر تھا۔ تو پھر وہ کون سی ذہنی کیفیات اور جبلّتیں تھیں جنہوں نے انسان کو اُس ابتدائی زمانے میں یہ مشترک ارادہ پیدا کرنے کے قابل بنایا؟ اقبال کے جاوید نامہ سے ہمیں جواب ملتا ہے: ”سروش کی موسیقی“!

سروش کی موسیقی

جاوید نامہ کے پہلے باب میں جب اقبال اور مولانا روم وِشوامتر کے غار سے باہر آتے ہیں (جس کا ذکر پچھلے باب میں ہُوا) تو وہ سروش کو دیکھتے ہیں۔ پارسی یعنی زرتشتی مذہب میں سروش ایک فرشتہ ہے جو ضمیر یا مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے تخلیق کیے ہوئے فارسی ادب میں اُس کا کام شاعروں، موسیقاروں اور فنکاروں کے تخلیقی وجدان کی رہنمائی کرنا ہے۔ جاویدنامہ میں اُسے ایک نورانی مخلوق کے طور پر دکھایا گیا ہے: اُس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی ہے اور اردگرد کے پہاڑوں اور وادیوں کو روشن کر رہی ہے۔ وہ اپنے آپ میں مست گنگنا رہا ہے۔ تصوّرات اور مشاہدات اُس کے گرد گردش کر رہے ہیں اور نئی تصویریں، نئی تخلیقات اور نئے استعارے اُس کے آس پاس جنم لے رہے ہیں۔ مولانا روم اقبال سے کہتے ہیں:

> یہ خوبصورت ہستی خدا کے ذہن میں بنی، مگر اظہار کی خواہش اِسے دنیا میں لے آئی۔ یہ بھی ہماری طرح اجنبی ہے۔ ایک تنہا مسافر ہے۔ یہ ہمارے حواس چھین

کر اُنہیں بحال کرتا ہے! ہماری خواہشیں اس کے اثر سے پرورش پاتی ہیں اور دل کو اس کی سانسوں کی گرمی سے حرارت ملتی ہے۔ شاعر جب دل کے تار چھیڑتا ہے تو وہ دراصل سروش ہی کا فیض ہوتا ہے۔ خود میں نے اس کی نغمگی میں ایک نئی دنیا دریافت کی![1]

اِس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جب فن حقیقی وجدان سے لبریز ہو تو وہ نہ صرف فرد کو روحانی تازگی دیتا ہے بلکہ انسانوں کے درمیان قربت، ہمدردی اور ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ اور یہ جذباتی ہم آہنگی ایک اجتماعی ارادے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے:

عشق کے مِضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نُورِ حیات، عشق سے نارِ حیات[2]

سروش کی موسیقی اُس ماقبل تاریخ دور کی علامت ہو سکتی ہے جب انسانوں نے اپنی تخلیقی اور وجدانی صلاحیتوں کے ذریعے باہمی ربط استوار کیا۔ یہ انسانی تاریخ کا دُوسرا مرحلہ تھا۔ یعنی پہلے مرحلے میں انسان اپنی بقا کے لیے علم حاصل کرتے تھے اور خدا سے قرب کے لیے غور و فکر کرتے تھے (جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں دیکھا)۔ تب وہ چیزوں کو صرف اِس نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ اُن کی بقا میں کیا کردار ادا کر سکتی ہیں یا روحانی سوالات کے جواب فراہم کرنے میں کیا مدد کر سکتی ہیں۔ جب وہ مقاصد کسی حد تک حاصل ہو گئے تو فرصت ملی (اور شاید ضرورت بھی محسوس ہوئی) کہ اشیا کو صرف اُن سے حاصل ہونے والے فائدے کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ بلکہ اب اُن کی اپنی خوبصورتی اور معنویت پر بھی توجہ دی جائے۔ اُس زمانے کے غاروں کی وہ تصویریں جو آج کل دریافت ہوتی رہتی

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۴۳-۴۲

[2]

ہیں، وہ نغمے جو کبھی اُن غاروں میں گونجتے ہوں گے مگر اب ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں، اور وہ ابتدائی تخلیقی جذبے، سب کے سب اُس سماجی معاہدے کی ابتدائی صورتیں تھیں جو اَب تاریخ کے ''ڈی این اے'' کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ آج بھی ہماری تہذیب کی تہہ میں کام کر رہے ہیں:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصّۂ جدید و قدیم[1]

برفانی دَور کے بعد

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، آخری برفانی دور تقریباً گیارہ ہزار سات سو (۱۱۷۰۰) سال پہلے ختم ہوا۔ موسم گرم ہونے سے پودے اور جانور زیادہ ہونے لگے، اور اسی تبدیلی نے کھیتی باڑی کی شروعات کو ممکن بنایا۔ یہ صرف زندگی کے طریقے میں تبدیلی نہیں تھی بلکہ انسانوں کے ایک دوسرے اور اپنی دنیا سے تعلق کا انداز بھی بدل گیا۔ پہلے ہم جس طویل دور کی بات کر چکے ہیں، جس میں انسانوں نے مل کر تخلیقی انداز میں سوچا، وہ شاید انہیں اِس نئے دور کے لیے تیار کر رہا تھا۔ یعنی ایک جگہ ٹھہر کر مل جل کر زندگی گزارنا!

انسانوں نے فصلیں اگانا اور جانور پالنا شروع کیے، جس سے وہ ایک جگہ رہنے لگے اور کھانے کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرنے کی ضرورت کم ہو گئی۔ کھیتی باڑی دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف وقتوں پر شروع ہوئی۔ مثال کے طور پر، مشرقِ وسطیٰ میں گیہوں اور جو، چین میں چاول، اور امریکہ میں مکئی کاشت کی جانے لگیں۔ انسانوں نے بھیڑ، بکریاں اور

---

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص۱۹

گائے پالنی شروع کیں، جن سے کھانا، کپڑے اور کام کرنے والے جانور حاصل ہوئے۔ یوں بستیاں نہ صرف بڑی ہوئیں بلکہ زیادہ مدت تک قائم بھی رہنے لگیں۔

تاریخ کے اس دور کو "نیا پتھروں کا دور" (Neolithic Age) کہتے ہیں۔ یہ تقریباً دس ہزار (۱۰۰۰۰) سے تین ہزار ایک سو (۳۱۰۰) قبل مسیح تک جاری رہا۔ اب بھی لوگ پتھر کے اوزار ہی استعمال کرتے، مگر اب وہ انہیں چمکا کر مخصوص کاموں کے لیے تیار کرنے لگے تھے، جیسے کھیتی باڑی کے لیے!

دنیا کی قدیم ترین بستیوں کے جو آثار اب تک دریافت ہوئے ہیں (جن میں پاکستان کے علاقے بلوچستان میں واقع مہر گڑھ بھی شامل ہے)، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی کسانوں کی زندگیاں کافی ترقی یافتہ تھیں۔ انہوں نے گھروں کو ایک دوسرے کے قریب بنایا، برتنوں میں اناج ذخیرہ کیا اور دُور دراز بستیوں سے چیزوں کا تبادلہ بھی کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے نئے اوزار بنائے جیسے ہل اور پہیہ، جن سے کھیتی باڑی آسان ہوئی اور معاشرہ مزید ترقی کرنے لگا۔

لیکن ایک ہی جگہ بسنے سے کچھ مسائل بھی پیدا ہوئے۔ زمین اور وسائل پر جھگڑے ہونے لگے اور قریب رہنے کی وجہ سے بیماریاں آسانی سے پھیلنے لگیں۔ کھیتی کی وجہ سے کھانے کی اقسام بھی کم ہو گئیں جس سے صحت کے مسائل پیدا ہوئے۔

ان سب مشکلات کے باوجود سب سے بڑی ترقی یہ تھی کہ پہلے لوگ صرف قدرت کے مطابق جیتے تھے لیکن اب وہ سیکھنے لگے کہ دنیا کو اپنے فائدے کے لیے کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ مل جل کر جینے اور مقصد کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت تاریخ کے سفر میں ایک بہت بڑا قدم تھی۔ اِسی کی وجہ سے وہ تہذیبیں پیدا ہوئیں جن کے بارے میں ہم اگلے باب میں پڑھیں گے۔

باب ۳

تہذیب کا آغاز

۳۱۰۰ سے ۱۶۵۰ قبل مسیح

۳۱۰۰ قبل مسیح کے آس پاس انسانوں کی زندگی میں ایک خاص موڑ آیا۔ ہزاروں سال شکار، کھیتی باڑی اور زمین کے اُتار چڑھاؤ کو پہچاننے میں گزار کر انسان اب بستیاں نہیں بلکہ تہذیبیں بنانے لگے۔ دیہات قصبوں میں، قصبے شہروں میں اور شہر علم، فن، عبادت اور طاقت کے مراکز میں بدلنے لگے۔ پتھروں کے اوزاروں کی جگہ ایک دھات سامنے آ گئی: کانسی (Bronze)، جو تانبے اور ٹین کو ملا کر بنائی جا رہی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انسانوں نے پہلے سے کہیں بڑے پیمانے پر خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ موجودہ جنوبی عراق میں، جسے اُس وقت سومر کہا جاتا تھا، دنیا کے پہلے معلوم شہر وجود میں آئے۔ یہ صرف مکانوں کے جھرمٹ نہیں تھے۔ ان میں عبادت گاہیں، بازار، شہر کی دیواریں اور انتظامی دفاتر بھی شامل تھے۔ انسان اپنے ماحول پر قابو پانے لگے تھے۔ افراتفری میں سے ترتیب پیدا کر رہے تھے۔

اسی طرح کی ترقی کئی اور بڑے دریاؤں کے کنارے بھی ہو رہی تھی۔ مصر میں وادیٔ نیل کی تہذیب پھلنے پھولنے لگی تھی۔ ۳۱۰۰ ق م کے قریب بالائی اور زیریں مصر (upper and lower Egypt) ایک بادشاہت میں متحد ہوئے، جسے اِس تہذیب کا

باقاعدہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ مشرق میں دریائے سندھ کے کنارے وادیٔ سندھ کی تہذیب نے جنم لیا۔ اس کے شہر، جیسے ہڑپہ اور موہنجوڈارو، ابتدائی شہری منصوبہ بندی کی مثالیں تھے: سیدھی سڑکیں، اینٹوں کے مکانات اور نکاسی کا نظام! اِسی طرح شمال مشرق میں زرد دریا کے کنارے چین کی ابتدائی تہذیب ابھرنے لگی تھی۔

اُس دور کی سب سے اہم ایجادات میں سے ایک ''تحریر'' تھی۔ تحریر نے سب کچھ بدل دیا۔ اب انسانی یادداشت ایک زندگی سے آگے بڑھ سکتی تھی۔ خیالات، اصول اور کہانیاں محفوظ ہو سکتی تھیں، اور اگلی نسلوں تک پہنچ سکتی تھیں۔ ایک بچہ جو موہنجوڈارو جیسے شہر میں بڑا ہو رہا ہو وہ کئی نسلوں پرانے واقعات کے بارے میں سیکھ سکتا تھا۔ انسانوں کو پہلی بار ایک ایسی مشترکہ یادداشت ملی جو کسی ایک فرد سے زیادہ دیرپا تھی۔

تاہم اُس وقت دنیا کے تمام لوگ شہر نہیں بنا رہے تھے۔ یورپ، افریقہ اور وسطی و مشرقی ایشیا کے مختلف علاقوں میں قبائل اور ثقافتیں کھیتی باڑی، مویشی پالنے اور ہنرمندی کے ذریعے خوشحالی تلاش کر رہی تھیں۔ امریکہ اور آسٹریلیا کے دُور دراز براعظموں میں زبانی روایات، فنونِ لطیفہ اور فطری علوم نے ایسی برادریوں کو تشکیل دیا جن کی تاریخی اہمیت اگلے ادوار میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی۔

ہم اکثر قدیم تاریخ کو جنگوں اور مشکلات کا زمانہ سمجھتے ہیں لیکن اُس ابتدائی زمانے میں اُمید بھی چھپی ہوئی تھی۔ پہلی بار انسانوں کے پاس وہ ذرائع آئے تھے جن سے وہ اپنے ماحول کو ڈھال سکتے تھے، اپنے خیالات محفوظ رکھ سکتے تھے اور ایسی بستیاں قائم کر سکتے تھے جو نسلوں تک باقی رہیں۔ تہذیب صرف رہن سہن کی سہولت نہ تھی۔ یہ ایک اخلاقی کامیابی تھی جو ہزاروں برس کی جدوجہد، تبدیلی اور انتظار کے بعد حاصل ہوئی تھی۔

انسان اور دیوتا

۲۵۰۰ قبل مسیح کے قریب تہذیب کا لہجہ بدلنے لگا۔ انسانوں نے مل جل کر جو کامیابیاں حاصل کی تھیں وہ اب کچھ مخصوص لوگوں کی ملکیت بننے لگیں۔ مصر میں فرعون اب صرف اتحاد کا نشان نہیں رہا تھا۔ وہ خود کو خدا کی مرضی کا نمایندہ قرار دینے لگا اور معاشرے میں اونچ نیچ پر مبنی طبقات بنا دیئے جن میں ہر فرد کی جگہ متعین تھی۔ میسوپوٹیمیا میں ہر شہر کا ایک الگ دیوتا یا دیوی ہوتی اور بادشاہ دعویٰ کرتا کہ اُسے اُسی دیوتا یا دیوی نے چُنا ہے۔ وہاں زگورات (شہروں کے بیچ اونچے مندر) بنائے گئے۔ وہ ظاہر کرتے تھے کہ حکومت اور مذہب کی بنیاد مقدس طاقت پر ہے۔ اسی قسم کی تبدیلیاں اناطولیہ (موجودہ ترکی)، ایجیئن (موجودہ یونان) اور دیگر علاقوں میں بھی ہو رہی تھیں۔

انسان، جو تعمیر اور یادداشت کی صلاحیت حاصل کرنے پر خوش ہوا تھا، اب ایک فرضی کائناتی درجہ بندی کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا۔ تہذیب کی نعمتیں برابر نہیں بانٹی جا رہی تھیں۔ ضمیر کی آزادی محدود ہوتی جا رہی تھی۔ انسانی سفر جاری تھا مگر اب اندھیروں میں بھٹکنے لگا تھا۔ وقت آ چکا تھا کہ کوئی ان مندروں اور محلات سے ہٹ کر کھلے میدان میں نکلے، ایک مختلف سچائی کی تلاش میں!

حضرت ابراہیم علیہ السلام

تورات اور قرآن دونوں میں حضرت ابراہیمؑ ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ خدا کے رسول، اور قوموں اور مذاہب کے بانی ہیں۔ وہ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں کے والد

تھے: ایک کی نسل سے بنی اسرائیل آئے اور دوسرے آنحضورؐ کے جدِامجد ہیں۔

عام طور پر سمجھا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۱۹۰۰ قبل مسیح کے آس پاس تھا (اگرچہ دُوسرے اندازے بھی پیش کیے گئے ہیں)۔ وہ میسوپوٹیمیا یا اُس کے قریب کے علاقے میں رہتے تھے۔ انہوں نے کنعان (موجودہ فلسطین و اسرائیل)، مصر اور عرب کے سفر بھی کیے۔

قرآن کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے زمانے کے مشرکانہ مذہب کا واضح انکار کیا اور خدا کی وحدت یعنی توحید کا اظہار کیا: "میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، وہی میری رہنمائی کرے گا۔" (الصافات: ۹۹)۔ یہودیوں کے لیے حضرت ابراہیمؑ بنی اسرائیل کے جدِ امجد ہیں۔ اُنہوں نے خدا کے ساتھ جو عہد (covenant) کیا، وہی یہودیوں کی شناخت کی بنیاد ہے۔ مسیحی اُن کے ایمان میں اپنے نجات کے تصوّر کی بنیادیں دیکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے لیے حضرت ابراہیمؑ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ تعمیر کیا تاکہ صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے ایک مرکز قائم ہو سکے:

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا[1]

حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے جڑی کچھ روایات آج بھی اسلامی شعائر میں زندہ ہیں۔ مثال کے طور پر بی بی ہاجرہؑ کا پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا، جسے "سعی" کے نام سے حج کا حصہ بنایا گیا۔ اِسی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر کی جانے والی قربانی

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۱۷۲

حضرت اسماعیلؑ کے خدا کی راہ میں قربان ہو جانے پر آمادگی کی یاد دلاتی ہے۔

*

یوں حضرت ابراہیمؑ قدیم انسانی تہذیب اور بعد میں آنے والے عالمی مذاہب کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اِس کے علاوہ جب ہم قرآن شریف میں بیان کیے گئے حضرت ابراہیمؑ کے مکالموں کا موازنہ حضرت نوحؑ کے مکالموں سے کرتے ہیں، تو ہمیں ایک اہم فرق نظر آتی ہے۔ اگرچہ دونوں پیغمبروں کا پیغام ایک ہی تھا لیکن حضرت نوحؑ کے مکالمات میں یہ پیغام صرف خدا کی وحدانیت کے موضوع پر مرکوز رہتا ہے۔ دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ کے مکالمے خدا کی وحدانیت کی روشنی میں کئی اضافی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، جن میں سماجی اور سیاسی موضوعات سے لے کر کائنات اور زندگی کے گہرے راز تک شامل ہیں۔ اِس سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایک زیادہ ترقی یافتہ معاشرے سے خطاب کر رہے ہیں جس کی ضروریات زیادہ وسیع اور قدرے پیچیدہ ہو چکی ہیں۔

اِن دونوں رسولوں کے اندازِ بیان میں جو فرق ہے، وہ بھی ان دونوں کے معاشروں کے درمیان اِسی فرق کا احساس دلاتا ہے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں تفصیل سے دکھایا گیا، حضرت نوحؑ نے لوگوں کو توحید کی طرف بلانے کے لیے صرف اُن کی نیت کو مخاطب کر کے اُن سے تقاضا کیا کہ وہ خود ہی اپنے دلوں کو توحید کی طرف مائل کریں۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہی پیغام اپنے سامعین تک پہنچاتے ہوئے ایسے ایسے دلائل سے کام لیا جن کے سامنے ایک انتہائی ترقی یافتہ ذہن بھی لاجواب ہو جائے۔ ایک موقع پر اُنہوں نے ایک بادشاہ سے کہا کہ خدا وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے۔ بادشاہ

نے اِس بات کو گھمانے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ اختیار تو وہ خود بھی رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا، ”اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اُسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔“(البقرہ:۲۵۸)۔

حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے پیغامات کی بنیاد ایک ہی تھی۔ اس کے باوجود دونوں رسولوں کے اندازِ بیان کا فرق ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے تک انسانی تہذیب میں کتنی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور معاشرہ کتنی ترقی کر چکا تھا۔ گویا انسانی ارادہ اب صرف بقا کے لیے ساتھ جینے کی خواہش نہیں بلکہ سچ کی تلاش میں نسلوں اور قوموں کی حدیں عبور کرنے کی قوت بن رہا ہے۔ جس طرح پچھلے دور میں فنونِ لطیفہ نے جذباتی یکجہتی پیدا کی، اب کہانیوں اور شاعری جیسے فنون سوچ کو بلند کرنے میں مدد دے رہے ہیں، اور یہ حضرت ابراہیمؑ کے ورثے کا وہ پہلو ہے جو ہم اب دیکھیں گے۔

سروش کی شاعری

جاوید نامہ کے پہلے باب میں جب اقبال اور مولانا روم سروش کا نغمہ سنتے ہیں تو اُس کے بعد مولانا روم کی تجویز پر اقبال اُس نغمے کے الفاظ پر بھی غور کرتے ہیں۔ یہ نغمہ دراصل سات اشعار پر مشتمل ایک غزل ہے۔ تاریخِ انسانی کے سات مراحل کے لیے ایک ایک شعر! اِس طرح یہ اشعار اُن مراحل پر بھی روشنی ڈال رہے ہیں جو مستقبل میں پیش آنے والے ہیں– ”جب میں نے رازی کی تفسیر کا سُرمہ اپنی آنکھ سے دھو ڈالا تو مجھے خدا کی کتاب میں قوموں کی تقدیر نظر آنے لگی!“:

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فروشستم

تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بکتاب اندر![1]

یہی اُس قسم کے ادب کا اصل کام ہے جسے اقبال "یکرنگ ثقافت" (uniform culture) کہتے ہیں۔ یعنی ایسا فن اور ادب جو معاشرے کے ہر طبقے اور ہر مکتبِ فکر میں مقبول ہو جائے۔ کم سے کم جس زمانے میں اُسے پیش کیا گیا، اُس زمانے میں اُس نے ضرور سب کے دل چھوئے ہوں۔ مولانا روم اور اقبال کا اپنا کام بھی اِسی دائرے میں آتا ہے۔ اقبال اِس قسم کے ادب کو اُس وجدان سے جوڑتے ہیں جس کی علامت سروش ہے۔ جیسا کہ غالب نے بھی کہا ہے کہ اُن کے اشعار کے مضامیں غیب سے اُن کے ذہن میں آتے ہیں گویا اُن کے قلم کی سرسراہٹ سروش کی آواز ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فنکاروں پر پابندی ہونی چاہیے کہ وہ صرف اِسی قسم کا آرٹ تخلیق کریں۔ فنکاروں کے پاس آزادی ضرور ہونی چاہیے لیکن دوسری طرف معاشرے کو بھی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کس قسم کا آرٹ منتخب کرتا ہے۔ کیونکہ اچھا یا برا جو بھی ادب پوری قوم کے خیالوں پر چھا جائے، وہی قوم کی تقدیر کو بھی ڈھالتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ، جن کا ذکر ابھی ہُوا ہے، صرف قوموں اور مذاہب ہی کے بانی نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کے اثرات نے ادب کو بھی ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ وہ دو ایسی روایتوں کے نقطہ آغاز پر کھڑے ہیں جو آج بھی عالمی ادب کو متاثر کر رہی ہیں یعنی بائبل اور قرآن! یہ دونوں صحیفے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اُسی پیغام کو آگے بڑھا رہے ہیں جو

[1] اقبال، جاوید نامہ، ص ۴۳

حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا تھا۔ اور دنیا کا نصف سے زیادہ ادب اِنہی دونوں صحیفوں کے زیرِ اثر وجود میں آیا ہے۔ مغرب میں کنگ آرتھر کی کہانیوں اور شیکسپیئر کے ڈراموں سے لے کر جدید سائنسی فکشن تک بائبل کے اثرات ادب میں جاری وساری دکھائی دیتے ہیں۔ اور اسلامی دنیا میں عطار اور رومی کی شاعری سے لے کر پاکستان کے قومی ترانے اور قومی نغموں تک قرآن کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

اِس طرح حضرت ابراہیمؑ کے پیغام نے آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے انسان کے ادبی شعور پر جو اثرات مرتب کرنا شروع کیے اُنہوں نے تہذیبوں کے سوچنے کا انداز بدل ڈالا۔

یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ابراہیمی روایت (یعنی بائبل اور قرآن) میں موجود حضرت نوحؑ کے واقعے کا قدیم میسوپوٹیمیا کی کہانی گلگامیش میں موجود طوفان کی کہانی سے موازنہ کرتے ہیں، جو اتفاق سے اُسی مذہب کی ایک مقدس دستاویز ہے جس مذہب کے خلاف حضرت ابراہیمؑ نے بغاوت کی تھی۔

گلگامیش کی کہانی کے مختلف نسخے اندازۃً ۲۱۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م کے زمانے میں میسوپوٹیمیا میں لکھے جارہے تھے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں یہ کہانی اُنہی کے پیدائشی وطن کے مذہبی حلقوں میں سنی، سنائی اور لکھی جاتی تھی۔ اُس کہانی میں اُتناپشتِم نامی شخص کو ایک دیوتا خفیہ طور پر طوفان کے بارے میں خبردار کرتا ہے۔ اُس سے کہا جاتا ہے کہ ایک کشتی بنائے، اپنے خاندان کو بچائے اور دوسروں سے جھوٹ بولے کہ وہ کسی اور وجہ سے شہر چھوڑ رہا ہے۔ طوفان کے بعد دیوتا اُسے ہمیشہ کی زندگی دے دیتے ہیں اور وہ باقی انسانوں سے الگ ہو کر رہنے لگتا ہے۔

اِس کہانی سے وہ گہرے نتائج اخذ نہیں کیے جاسکتے جو ہم نے پچھلے باب میں حضرت

نوحؑ کے واقعے سے اخذ کیے تھے۔ چنانچہ اِس کہانی کا ابراہیمی روایت کے عطا کیے ہوئے قصۂ نوحؑ سے موازنہ کر کے ہم مشرکانہ سوچ اور ابراہیمی سوچ کے درمیان فرق بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اُتناپشتم کے برعکس حضرت نوحؑ کوئی خفیہ بچ نکلنے والے انسان نہیں بلکہ ایک نبی اور رسول ہیں جو کئی نسلوں تک اپنی قوم کو خبردار کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی نجات قیادت کی علامت ہے، تنہائی کی نہیں۔ وہ کشتی سے باہر نکل کر نئی دنیا تعمیر کرتے ہیں۔ اُتناپشتِم کی کہانی کہتی ہے، "کبھی کبھار دیوتا ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایک کشتی بنالو، جھوٹ بولو اور اپنے فائدے کی فکر کرو۔ شاید بچ جاؤ۔" حضرت نوحؑ کی کہانی کہتی ہے، "سچ پر قائم رہو، دوسروں کو خبردار کرو، اتحاد قائم رکھو تو طوفان بھی ایک نیا آغاز بن سکتا ہے۔"

*

اگر حضرت ابراہیمؑ وہ پیغمبر ہیں جن کے اثرات نے ایک نئے الہامی ادب کی بنیاد رکھی تو اُن کے پڑپوتے حضرت یوسفؑ وہ پیغمبر ہیں جن کی بدولت ہمیں ادب کو سمجھنے یعنی ادبی تنقید کے وہ رویے حاصل ہوتے ہیں جو اِس قسم کے ادب کے شایانِ شان ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے والد حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا۔ وہ حضرت اسحٰقؑ کے صاحبزادے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کا واقعہ بائبل اور قرآن دونوں میں موجود ہے۔ البتہ قرآن نے اِسے سورۂ یوسف میں ایک خاص طریقے سے بیان کیا ہے، جو قرآن کے اپنے الفاظ میں "احسنُ القصص" (تمام قصوں میں بہترین) ہے۔ حضرت یوسفؑ بچپن میں خواب دیکھتے ہیں کہ چاند، سورج اور ستارے اُنہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ یہ خواب سن کر کہتے ہیں، "یقیناً تمہارا رب تمہیں منتخب کرے گا، اور تمہیں باتوں کی حقیقت سمجھنا سکھائے گا، اور اپنی نعمت تم پر اور آلِ یعقوب پر پوری کرے

گا—جیسے اُس نے پہلے تمہارے باپ دادا، ابراہیم اور اسحاق پر پوری کی تھی۔"

قرآن کے جن الفاظ کا ترجمہ ہم نے یہاں "باتوں کی حقیقت کو سمجھنا" کیا ہے، وہ دراصل تاویلُ الاحادیث ہیں۔ عام طور پر اِس سے خوابوں کی تعبیر مراد لی گئی ہے لیکن درحقیقت اِس میں ایک زیادہ گہرا مطلب بھی چھپا ہے۔ جب خواب اور زندگی کو تخلیق کرنے والا خدا ایک ہے تو جس بنیاد پر حضرت یوسفؑ خوابوں سے انسانوں اور قوموں کی تقدیر اخذ کرتے ہیں، اُسی بنیاد پر ادب اور تاریخ کو سمجھ کر ہم اُن سے بھی تقدیر کے راز سیکھ سکتے ہیں۔ وہ بنیاد توحید ہے:

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری،
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہَوس چھُپ چھُپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں![1]

یہی اقبال کا نظریۂ ادب ہے کہ ادب محض ہمارے حال کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ ہمیں وہ بننے کی مشق کراتا ہے جو ہم بن سکتے ہیں۔ ایک معاشرے کی محبوب ترین کہانیاں اُس کا خاموش نصاب بن جاتی ہیں اور بالآخر اُس کی تقدیر بھی!

جب پرانا نظام لرزنے لگا

۸۰۰ قبل مسیح کے آس پاس، جب حضرت ابراہیمؑ کا پیغام مکمل ہو چکا تھا اور حضرت یوسفؑ کی کہانی کا آغاز ہونے والا تھا، دُنیا کے قدیم نقشے میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہونے

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۰۹

لگی۔ چاہے ان پیغمبروں کے اثرات دوسری جگہوں تک پہنچے ہوں، چاہے وہاں خدا نے دُوسرے پیغمبر بھیجے ہوں، چاہے زندگی کی اپنی لہر نے انسانی ضمیر کو اُکسایا ہو، بہرحال ہمیں اُس زمانے میں ایک خاص رجحان پھیلتا نظر آتا ہے جو اِن پیغمبروں سے منسوب پیغام کے ساتھ مناسبت کا کوئی نہ کوئی پہلو لیے ہوئے تھا۔ پرانی سلطنتوں پر جمود طاری ہو رہا تھا یا وہ اندر سے ٹوٹ رہی تھیں۔ کناروں پر موجود اقوام فوجی، ثقافتی، اور اخلاقی اعتبار سے اُبھر رہی تھیں۔ تہذیب کے بیج اب طاقت کے مراکز سے نہیں بلکہ حاشیوں سے پھوٹ رہے تھے۔

اس تبدیلی کی ایک واضح مثال اموری قوم تھی، جسے طویل عرصے تک میسوپوٹیمیا کے معززین نے محض مغربی صحراؤں کے خانہ بدوش قبائل سمجھ کر نظرانداز کیا تھا۔ مگر تقریباً ۱۷۵۰ ق م میں وہ بابل میں طاقت کے مرکز پر قابض ہو چکے تھے اور وہاں اُن کا بادشاہ حمورابی حکومت کر رہا تھا۔ پچھلے بادشاہوں کی طرح اُس نے بھی اپنی حکومت کو دیوتاؤں کی طرف سے دی گئی امانت قرار دیا لیکن دوسرے بادشاہوں کے برعکس اُس نے اپنے قوانین کو باقاعدہ طور پر تحریر کر کے عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ یہ قوانین بھی طاقتور طبقے کے حق میں جھکاؤ رکھتے تھے لیکن پھر بھی ان میں یہ انقلابی پہلو موجود تھا کہ انصاف اب صاحبِ اقتدار شخص کی مرضی پر منحصر نہ رہا بلکہ پتھر پر نقش ہو کر سب کے سامنے آ گیا۔

*

اسی دوران مصر کو بھی ایک زبردست سیاسی جھٹکا لگا۔ ۱۸۰۰ ق م کے لگ بھگ غالباً شام، لبنان، اردن اور فلسطین کے علاقوں سے کچھ سامی النسل اقوام نے مصر کے مشرقی حصے پر

حکومتیں قائم کرنا شروع کیں۔ بعض محققین نے رائے دی ہے کہ حضرت یوسفؑ کے واقعے میں جس بادشاہ کا ذکر ہے وہ انہی نئے حکمرانوں میں سے تھا اور بنی اسرائیل بھی اسی زمانے میں مصر میں داخل ہوئے۔

مصریوں نے ان غیر ملکی حکمرانوں کو ''ہکسوس'' (Hyksos) کہا، جس کا مطلب ''اجنبی سردار'' یا ''غیر ملکی ارباب'' ہے۔ تقریباً ۱۶۵۰ ق م میں، ہکسوس نے دریائے نیل کے شمالی علاقے یعنی زیریں مصر پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اُنہوں نے اوارس (Avaris) نامی شہر میں اپنی حکومت قائم کی۔ انہوں نے نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی، جیسے گھوڑا گاڑی اور نئے انداز کے تیر کمان۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے مصر کو برباد نہیں کیا بلکہ نسبتاً پر امن انداز سے حکومت کی۔ جنوبی مصر (بالائی مصر) پر مقامی مصری حکمرانوں کی حکومت بھی برقرار رہنے دی۔ تب بھی مصریوں نے اِس واقعے میں بڑی ذلّت محسوس کی۔ وہ صدیوں سے فرعون کو دیوتا تسلیم کرتے آئے تھے۔ دیوتاؤں کی سرزمین پر ''اجنبی سرداروں'' کی حکومت نے اُس عقیدے کو اِس طرح پاش پاش کر دیا تھا جیسے حضرت ابراہیمؑ کی ضرب سے دیوتاؤں کے بُت ٹوٹ گئے ہوں۔ ہکسوس نے صرف حکمرانوں کو نہیں بدلا تھا۔ اُنہوں نے حکمرانی کے معنی بدل ڈالے تھے۔ اُنہوں نے دنیا کو دکھا دیا تھا کہ طاقت صرف مرکز سے نہیں آتی، حاشیے سے بھی ابھر سکتی ہے۔

باب ۴

چھوٹے ملک، بڑے عزائم

۱۶۵۰ سے ۵۵۹ قبل مسیح

قدیم تاریخ کے چوتھے مرحلے کے آغاز پر دنیا ایک قدیم سرد جنگ کی حالت میں دکھائی دیتی ہے۔

ایک طرف وہ مثبت رجحانات تھے جنہیں پچھلے باب میں ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کے پیغامات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی اور جنہیں حمورابی جیسی شخصیات اور حکسوس جیسی تہذیبوں کے ذریعے بھی تقویت پاتے دیکھا۔ دُوسری طرف اِن مثبت رجحانات کے مقابلے پر وہ پسماندہ قوتیں کارفرما دکھائی دیتی ہیں جو بادشاہوں کو دیوتاؤں کے ساتھ جوڑتی تھیں۔

مثال کے طور پر تقریباً ۱۶۰۰ ق م میں چین کی زرد دریا کی وادی میں شانگ خاندان کے بادشاہوں نے خود کو زمین اور آسمان کے درمیان ایک رابطے کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ اُنہوں نے آباؤ اجداد کی روحوں اور فال کی ہڈیوں سے غیب کا حال معلوم کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیوتاؤں کی مرضی کا نمایندہ قرار دیا۔ لیکن بعض مؤرخین کے مطابق اُسی زمانے میں ہمالیہ کے دُوسری طرف یعنی برصغیر میں وسطی ایشیا سے اُن آریائی اقوام کے غول آرہے تھے جو بعد میں ہندو تہذیب کے بانی قرار پائے:

اے آبِ رُودِ گنگا! وہ دِن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا[1]

یہ آریائی گروہ نغموں، رسومات اور شاعری کی ایک زرخیز زبانی روایت اپنے ساتھ لائے جو بعد میں ہندومت کی چار مقدس کتابوں، ویدوں، کی شکل اختیار کر گئی: ''تمہارے ذہن ایک ہو جائیں، تمہارے دل ہم آہنگ ہو جائیں؛ تم سب ایک ہی سوچ میں ڈھل جاؤ تاکہ تم خوشی سے ساتھ رہ سکو۔''[2]

اگلے چند سو برسوں تک، جنہیں ابتدائی ویدی دور (تقریباً ۱۵۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م) کہا جاتا ہے، معاشرہ قبائلی روایات پر مبنی رہا جن میں نسبتاً کافی آزادی تھی۔ بادشاہ سرداروں جیسے ہوتے تھے جنہیں اُن کی خوبیوں کی بنیاد پر چُنا جاتا تھا۔

دُوسری طرف اناطولیہ (موجودہ ترکی) میں اُسی زمانے میں اقتدار حاصل کرنے والی ایک تہذیب میں اچھے اور برے دونوں رجحانات کا ایک عجیب و غریب امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ یہ حِتّی قوم تھی جو تقریباً ۱۶۵۰ ق م سے ۱۱۸۰ ق م تک علاقے پر چھائی رہی اور اُس کے بعد تاریخ کے صفحات سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ ان کے بادشاہ ایک طرف دیوی دیوتاؤں کی مرضی کے نمائندے بھی سمجھے جاتے تھے اور دُوسری طرف اُن سے اخلاقی ضابطوں کی پابندی بھی کروائی جاتی تھی۔ انہوں نے ۱۲۵۸ ق م میں مصر کے ساتھ جو معاہدہ کیا اُسے سفارت کاری کی ایک ابتدائی علامت اور تاریخ کا قدیم ترین امن معاہدہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اُس کا ایک نسخہ اقوامِ متحدہ کے صدر دفتر میں بھی آویزاں ہے۔

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۸۲

[2]

*

لیکن انسان کو خدائی اختیارات دینے والی طاقتوں کی شاید سب سے بڑی جیت مصر میں ہوئی۔ وہاں ۱۵۵۰ ق م کے لگ بھگ جنوبی علاقوں (بالائی نیل) کے فرعون کی افواج نے ایک خونریز جنگ کے بعد شمالی علاقوں (زیریں نیل) پر حکومت کرنے والے ہکسوس حکمرانوں کا اقتدار ختم کر دیا۔

ہکسوس دارالحکومت آوارِس جس طرح تباہ کیا گیا اُس کی لرزہ خیز تفصیلات اتفاق سے تاریخ میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ مَردوں کو قتل کر دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا۔ ہکسوس اقوام کے کچھ لوگ جان بچا کر بھاگے اور موجودہ غزہ کے ایک شہر میں پناہ حاصل کی۔ لیکن مصری افواج نے تعاقب کر کے اُس شہر کو بھی تباہ کر دیا اور وہاں موجود پناہ گزین بھی بیدردی کے ساتھ قتل کیے یا غلام بنائے گئے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل یا تو وہی قوم ہیں جسے مصری ہکسوس کہتے تھے، ورنہ وہ ہِکسوس اقوام کے ساتھ قریبی تعلق ضرور رکھتے تھے۔ اِس لیے ہکسوس حکومت کے خاتمے کے بعد مصریوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔

اِن واقعات کے بعد مصر میں ایک نئے دَور کا آغاز ہُوا جسے اب "نئی بادشاہت" کہا جاتا ہے۔ اِس کا زمانہ تقریباً ۱۵۵۰ سے ۱۰۷۰ ق م ہے۔ لفظ "فرعون" (مصری زبان میں "پر-آ")، جس کے لفظی معانی شاندار گھر کے تھے اور جو عموماً شاہی محل کے لیے استعمال ہُوا کرتا تھا، اب براہِ راست حکمرانوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اور یہ فرعون پہلے سے زیادہ شدّت کے ساتھ یہ دعوے کرنے لگے کہ اِن کی مرضی دیوتاؤں کی مرضی ہے۔

ایک عارضی وقفہ فرعون اخناطون (حکمرانی: تقریباً ۱۳۵۳ تا ۱۳۳۶ ق م) کے دور

میں آیا۔ اُس نے ایک خدا، ''آطون''، کی عبادت متعارف کروائی، جسے سورج کی قرص (disk) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اخناطون کی ملکہ نفرتیتی، جو اُس کے اقتدار میں شریک تھی، آج قدیم تاریخ کا سب سے زیادہ جانا پہچانا نسوانی چہرہ بن چکی ہے جس کی وجہ ۱۹۱۲ء میں اُس کے ایک خوبصورت مجسمے کی دریافت ہے۔

تاہم اخناطون اور نفرتیتی کی یہ اصلاحات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں۔ اُس وقت کے بااثر حلقوں نے اُنہیں اُس وقت واپس لے لیا جب اخناطون کے بعد کم عمر فرعون توتنخ آمون کے دورِ حکومت میں طاقت اُن حلقوں کے ہاتھ میں آئی (توتنخ آمون بھی آج قدیم تاریخ کی مشہور ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے، جس کی وجہ ۱۹۲۲ء میں دریافت ہونے والا اُس کا مقبرہ اور سونے کا نقاب ہے)۔

فرعونیت اپنی انتہا پر اُس وقت پہنچی جب یہ سیتی اول (حکمرانی: تقریباً ۱۲۹۰ تا ۱۲۷۹ ق م) اور اُس کے بیٹے رعمسیس ثانی (حکمرانی: تقریباً ۱۲۷۹ تا ۱۲۱۳ ق م) کے ہاتھ میں آئی۔

اِس سے پہلے بھی حکمراں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتے رہے تھے اور بعض حکمرانوں نے کسی نہ کسی دیوتا کی انسانی صورت ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ لیکن رعمسیس ثانی نے اُن سب سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے آپ کو خدائے واحد قرار دے دیا۔ عظیم الشان یادگاروں کی تعمیر، جس پر ہکسوس کی شکست کے بعد مصری ریاست نے دوبارہ توجہ دینا شروع کی تھی، رعمسیس ثانی کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچی۔ بعض عبادت گاہیں صرف رعمسیس ثانی کی پرستش کے لیے مخصوص تھیں۔ اُن میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں جن پر نقش کلمات میں کہا گیا ہے، ''کوئی معبود نہیں سوائے رعمسیس کے'' اور ''رعمسیس وہ خدا ہے جو دعائیں سنتا اور لوگوں کو سانسیں عطا کرتا ہے۔''

یوں رعمسیس ثانی انسانی تاریخ کا واحد حکمراں ٹھہرتا ہے جس کے بارے میں ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ اُس نے اِتنے مکمل طور پر خدائی کا دعویٰ کیا۔ مسلمان عام طور پر سمجھتے ہیں کہ یہی وہ فرعون ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے: ”تو اُس نے کہا، 'میں تمہارا سب رب ہوں، سب سے عظیم!'“ (النازعات: ۲۴)۔ اور ایک اور مقام پر: ”میں نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور معبود ہے۔“ (القصص: ۳۸)۔

یہی دعوے تھے جنہیں ابراہیمی مذاہب کے عقیدے کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شکست دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام

ابراہیمی مذاہب کی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش مصر میں، غالباً ۱۲۵۰ قبل مسیح سے پہلے، رعمسیس ثانی کے ابتدائی دورِ حکومت میں کسی وقت ہوئی۔ اُن کے واقعات بائبل اور قرآن دونوں میں تفصیل سے لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ دونوں روایات کے مطابق وہ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے جو طویل عرصے سے مصر میں محکوم تھے۔ بعض مخصوص واقعات کے نتیجے میں حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی لیکن کسی کو انصاف دلانے کی کوشش کے دوران ایک مصری کو غیر ارادی طور پر ہلاک کر بیٹھنے کے بعد اُنہیں مصر سے رخصت ہونا پڑا۔ جلاوطنی کے کئی سال انہوں نے غالباً مشرقِ وسطیٰ کے کسی خطے میں گزارے۔ وہیں انہوں نے ایک جھاڑی کو آگ سے روشن دیکھا اور خدا کی آواز نے اُنہیں مخاطب کیا۔ لہٰذا اسلامی روایات میں حضرت موسیٰؑ کا لقب کلیم اللہ یعنی خدا سے کلام کرنے والا ہے۔

خدا نے حضرت موسیٰؑ کو واپس مصر جانے اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرنے کا حکم دیا اور اُن کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اُن کا مددگار بنا دیا۔ فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف سے ہونے والی شدید مخالفت کے دوران ایک مشہور مقابلہ بھی پیش آیا جو حضرت موسیٰؑ اور مصر کے جادوگروں کے درمیان تھا۔ بالآخر فرعون نے بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دے دی لیکن بعد میں فیصلہ تبدیل کر کے اُن کا پیچھا کیا۔

قرآن کے مطابق خدا نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ وہ اپنے عصا سے سمندر پر ضرب لگائیں۔ پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ دُوسرے کنارے پر جا پہنچے لیکن فرعون کا لشکر غرق ہو گیا۔ ڈوبتے وقت فرعون پکار اُٹھا، ”میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سرِ اطاعت جھکانے والوں میں سے ہوں۔“ لیکن خدا نے اُس کی توبہ مسترد کر دی: ”اب؟ جبکہ تم پہلے نافرمانی کرتے رہے اور فساد کرنے والوں میں سے تھے! آج ہم تمہارے جسم کو محفوظ کر لیں گے تاکہ تم اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی بنو۔“ (یونس: ۹۰-۹۲)۔ اگر ہم فرض کریں کہ یہ فرعون رعمسیس ثانی ہی تھا تو یہ واقعہ ۱۲۱۳ ق م میں پیش آیا کیونکہ تاریخی معلومات کے مطابق اُس برس رعمسیس ثانی کی موت واقع ہوئی تھی۔

*

اپنی آزادی کے پہلے چالیس برس میں بنی اسرائیل کوئی بڑا قدم نہ اُٹھا سکے۔

قرآن میں بیان کردہ واقعات سے اُن داخلی کمزوریوں کا پتا چلتا ہے جو اِس ناکامی کا سبب بنیں۔ مثلاً ایک موقع پر بنی اسرائیل ایک قوم کو بتوں کی عبادت کرتے دیکھتے ہیں تو جھٹ حضرت موسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بھی ایک معبود مقرر کر دو۔ حضرت

موسیٰؑ اُنہیں سختی سے جھڑک دیتے ہیں لیکن بعد میں اُن میں سے کچھ لوگ سامری نامی ایک جادوگر کی ترغیب پر سونے کے بنے ہوئے ایک بچھڑے کی پُوجا کرنے لگتے ہیں۔ اُن میں سے کئی کو سزا دی جاتی ہے، اور باقی لوگوں کے ساتھ خدا اپنا عہد دوبارہ اُستوار کرتا ہے۔ خدا حضرت موسیٰؑ کے ذریعے دس بنیادی احکامات (The Ten Commandments) بھی نازل کرتا ہے جو بعد میں یہودی نظامِ اخلاق کی بنیاد بنے۔ ایک موقع پر جب پانی کی کمی کا سامنا ہوتا ہے تو حضرت موسیٰؑ ایک چٹان پر ضرب لگاتے ہیں اور بارہ چشمے جاری ہو جاتے ہیں، ہر قبیلے کے لیے ایک!

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر![1]

اِسی طرح بنی اسرائیل کو بغیر محنت کے خوراک فراہم کی جاتی ہے جسے من و سلویٰ کہا گیا ہے۔ لیکن وہ اِس انعام کو شکر کے ساتھ قبول کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰؑ اُنہیں اُس مقدس سرزمین میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں جو خدا نے اُنہیں عطا کر دی ہے تو وہ انکار کرتے ہوئے جواب دیتے ہیں، "اے موسیٰ! جاؤ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایک گائے ذبح کریں تو وہ اِدھر اُدھر کے سوالات پوچھنے لگتے ہیں۔ اُن کے ایک اور عجیب طرزِ عمل کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:

اور جب ہم نے کہا: اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور جہاں سے چاہو فراوانی سے کھاؤ، اور دروازے میں عاجزی سے داخل ہو جاؤ اور کہو، "حِطَّةٌ" (توبہ) تاکہ

[1] اقبال، ضربِ کلیم، سرورق

تمہارے گناہ معاف کیے جائیں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو مزید انعام دیں گے۔
لیکن ظالموں نے وہ بات بدل دی جو اُن سے کہی گئی تھی، تو ہم نے اُن پر آسمان
سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ مسلسل نافرمانی کرتے تھے۔ (البقرہ:۵۸-۵۹)

بنی اسرائیل کے اِس ابتدائی دورِ آزادی کو قرآن نے جس انداز میں بیان کیا ہے اُس سے ہمیں اُس ذہنی کیفیت کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے جو طویل سیاسی غلامی یا تہذیبی زوال کے نتیجے میں کسی بھی قوم میں پیدا ہو جاتی ہے:

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہُوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر![1]

قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور ایک پُراسرار شخصیت کے درمیان ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے جن کا نام قرآن میں درج نہیں ہے لیکن بعد کی اسلامی روایات نے انہیں حضرت خضرؑ کے نام سے یاد کیا ہے۔ قرآن کے مطابق انہیں خدا کی طرف سے ایک خاص علم عطا ہوا تھا جو عام ذہانت سے مختلف تھا۔ اِس سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ تاریخ کے سفر میں تدبیر کے ساتھ ساتھ تقدیر کا دخل بھی ہے اگرچہ اُس تقدیر سے فائدہ اٹھانا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

*

بائبل کے مطابق بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے بعد بالآخر مشرقِ وسطیٰ کے کچھ علاقوں میں آباد ہو گئے اور ایک قبائلی اتحاد کی شکل اختیار کر لی۔

---

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص۸

اُس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک وہ چھوٹے چھوٹے شہروں پر حکومت کرتے رہے۔ اس عرصے میں اُن کی قیادت ''قاضیوں'' کے ہاتھ میں تھی۔ بائبل کے مطابق یہ ایسے قبائلی رہنما تھے جو خدا کی طرف سے چنے گئے اور ان میں کچھ خواتین بھی شامل تھیں۔ اُس دَور کی مشہور ترین کہانیوں میں طاقتور شمشون (Samson) اور خوبصورت لیکن دغاباز دلائلہ (Delilah) کا المیہ شامل ہے۔

سمجھا جاتا ہے کہ ۱۰۵۰ ق م کے آس پاس حضرت طالوت بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ بنے۔ اُن کے دورِ حکومت میں، بنی اسرائیل نے موجودہ یروشلم کے قریب وادیٔ ایلہ میں اپنے سے کہیں زیادہ بڑی ایک فوج پر شاندار فتح حاصل کی۔ یہ جنگ جو غالباً ۱۰۲۵ ق م یا ۱۰۱۰ ق م میں ہوئی، اُس مشہور واقعے کی وجہ سے یاد رکھی جاتی ہے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام نے، جو بنی اسرائیل کے ایک نوجوان تھے، صرف ایک فلاخن (پرانے زمانے کی غلیل) اور پتھروں کے ذریعے دیو ہیکل دشمن جالوت کو ہلاک کر دیا۔

حضرت داؤدؑ نے (تقریباً ۱۰۱۰ ق م سے ۹۷۰ ق م تک) بنی اسرائیل پر حکومت کی اور قبائل کو متحد کر کے بنی اسرائیل کی ایک مشترکہ سلطنت قائم کی۔ قرآن کے مطابق اُن پر خدا کی طرف سے زبور بھی نازل کی گئی (''اے پہاڑو، اُس کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ، اور پرندو، تم بھی!'') اور اُنہیں آہن گری یعنی لوہے سے چیزیں بنانے کی ایک خاص مہارت بھی عطا کی گئی (''اور ہم نے اُس کے لیے لوہا نرم کر دیا'')۔ یہ بات اِس لحاظ سے بھی معنی خیز ہے کہ اُس زمانے میں کانسی کی جگہ لوہے کا استعمال شروع ہو رہا تھا اور مشرقِ وسطیٰ میں آہنی دَور یعنی لوہے کے دَور کا آغاز ۱۲۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ ق م کے درمیان تسلیم کیا گیا ہے۔

حضرت داؤدؑ کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام، جن کی بادشاہت کا زمانہ ۹۷۰ ق م

سے ۹۳۱ ق م کے لگ بھگ سمجھا جاتا ہے، قرآن کے لحاظ سے نہ صرف انسانوں بلکہ ہواؤں، جِنّات اور زمین کی دوسری مخلوقات پر بھی حکومت کرتے تھے: "ایسی بادشاہی جو میرے بعد کسی کو نہ دی جائے گی" (سورۃ ص:۳۸)۔ قرآنی واقعات میں ہم اُنہیں چیونٹیوں اور پرندوں کی زبان سمجھتے، عناصرِ فطرت پر حکم چلاتے، اور دانائی اور سکون کے ساتھ حکومت کرتے دیکھتے ہیں۔

اِس طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کے درمیان کی تین صدیاں ایک بے پناہ انسانی توانائی کی بتدریج ترقی پر مبنی نظر آتی ہیں جو پہلے پہل حضرت موسیٰؑ کی عظیم شخصیت میں اِس طرح ظاہر ہوتی ہے جیسے ایک پرشور دریا اچانک پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے نمودار ہو جائے۔ یہ بپھری ہوئی توانائی حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں میں سمندروں اور چٹانوں کے جگر چاک کرتی ہے۔ حضرت داؤد کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم کرتی، اور پہاڑوں اور پرندوں کو انسان کے ساتھ ہم نوا کرتی ہے۔ اور بالآخر حضرت سلیمانؑ کی صورت میں عناصرِ فطرت اور تمام مخلوقات پر ایک پرسکون حکمرانی بن جاتی ہے۔

پچھلے مرحلے میں ہم نے دیکھا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے وحدت کے اصول سے ایک پرانے نظام کو اُلٹ دیا تھا اور پھر اُن کے پوتے حضرت یوسفؑ نے اُسی اصول کو استعمال کرتے ہوئے ایک نیا نظام تشکیل دیا تھا۔ بالکل اُسی طرح یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی بخشی ہوئی جس طاقت کے ذریعے حضرت موسیٰؑ نے سلطنتوں کو درہم برہم کر کے فطرت کی قوتوں کو چیلنج کیا اُسی کو اُن کے جانشین حضرت سلیمانؑ نے ایک مستحکم حکومت کی بنیاد بنا کر دکھایا۔ اور یہ قوّت اِس بات کا اشارہ تھی کہ حقیقی حکمرانی کائنات کی پوشیدہ قوّتوں کے ساتھ اِتنی گہری ہم آہنگی پیدا کرنے میں ہے کہ وہ آپ کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں:

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ[1]!

اِک تازہ جہاں

۱۳۰۰ اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان جب قدیم دنیا میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، تین بڑے رجحانات نمایاں ہوئے: چھوٹی بادشاہتوں کا عروج، افسانوی ہیروز کا زمانہ، اور نئے قوانین کا ظہور۔ درحقیقت یہ تینوں ایک بہت بڑی تبدیلی کی علامتیں تھیں۔

تقریباً ۱۲۰۰ ق م کے آس پاس وہ عظیم تہذیبیں جو صدیوں سے طاقتور چلی آرہی تھیں بڑی تیزی کے ساتھ زلزلوں، حملوں، بغاوتوں اور قحط کے ایک سلسلہ وار عمل کے نتیجے میں ختم ہو گئیں یا اپنی شان و شوکت کھو بیٹھیں۔ اُن کی جگہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں تاریخ کے اُفق پر چھا گئیں۔

اناطولیہ میں حتّی قوم ۱۱۸۰ ق م کے لگ بھگ تاریخ سے غائب ہو گئی جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یونان میں مائسینی تہذیب، جو کچھ صدیاں پہلے قلعوں، محلات اور شاندار فنِ تعمیر کے ساتھ اُبھری تھی، ۱۲۰۰ ق م کے بعد زوال پذیر ہوئی اور ۱۰۵۰ ق م تک ختم ہو گئی۔ زوال کی وجوہات میں قدرتی آفات کے علاوہ پراسرار سمندری حملہ آوروں کے حملے

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۷۸

بھی شامل تھے جنھیں ”بحری اقوام“ (Sea Peoples) کہا جاتا ہے اور جن کی حقیقت اب ماضی کے پردوں میں گم ہو چکی ہے۔

اُنہوں نے مصر پر بھی حملے کیے۔ مصر بچ تو گیا لیکن اپنی طاقت سے محروم ہو گیا۔ ۱۱۷۷ ق م میں ان پر فتح حاصل کرنے کے بعد مصر کا زوال شروع ہو چکا تھا جب اس کے وسائل گھٹ رہے تھے اور علاقے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔

دُور چین میں ۱۰۴۶ ق م کے قریب شانگ خاندان اقتدار سے محروم ہو گیا اور ژو خاندان نے ایک طاقتور مرکز کے بجائے چھوٹی چھوٹی جاگیروں پر مبنی نظام قائم کیا جس میں علاقائی سردار نیم خود مختار تھے، بالکل اُن چھوٹے شہروں کی طرح جو اُسی زمانے میں دنیا کے دیگر حصوں میں ابھر رہے تھے۔

*

اُن اُبھرتی ہوئی ثقافتوں میں ایک نمایاں نام فونیقی (Phoenician) تہذیب کا ہے۔

یہ لوگ مشرقی بحیرۂ روم کے کنارے پر (موجودہ لبنان میں) صدیوں سے مقیم ملاح، تاجر اور کاریگر تھے۔ تقریباً ۱۲۰۰ ق م کے بعد یہ لوگ ابھرنے لگے لیکن زمینی سلطنتوں کے برعکس انہوں نے کوئی وسیع بادشاہت نہیں بنائی۔ ان کے شہروں (صور، صیدا اور بائیبلوس) کے رُخ سمندر کی جانب تھے۔ یہ لوگ دُور دُور تک تجارت کرتے تھے لیکن ان کا ہمیشہ رہنے والا تحفہ ان کا رسم الخط تھا۔

اب تک دنیا میں پیچیدہ اور تصویری رسم الخط رائج تھے۔ اُن کے برعکس فونیقیوں نے صرف بائیس علامات استعمال کیں جن میں سے ہر ایک کسی مخصوص آواز کو ظاہر کرتی تھی (جس طرح آج اُردو، انگریزی اور اکثر دوسری زبانوں کے حروفِ تہجی میں ہوتا ہے

کیونکہ یہ سب کسی نہ کسی انداز میں فونیقی حروفِ تہجی ہی سے بر آمد ہوئے ہیں)۔ چونکہ یہ رسم الخط سیکھنا اور لکھنا آسان تھا اِس لیے اِسے دوسری قوموں نے بھی اپنایا، بدلا اور آگے منتقل کیا۔ چنانچہ آج جب آپ اپنے کمپیوٹر یا فون میں ٹائپ کرتے ہیں تو درحقیت آپ بھی فونیقی تاجروں کو خاموش خراجِ تحسین پیش کر رہے ہوتے ہیں، خواہ یہ بات آپ کو معلوم نہ ہو!

*

دُوسری طرف یہی دَور یعنی ۱۳۰۰ سے ۱۰۰۰ ق م کا زمانہ وہ ہے جسے بعد میں دنیا کی مختلف تہذیبوں نے اپنے سب سے زیادہ مافوق الفطرت کارنامے انجام دینے والی شخصیات کا زمانہ قرار دیا۔

ابراہمی مذاہب کی روایات میں جو شخصیات اِس دَور سے منسوب ہیں، اُن کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے: حضرت موسیٰؑ، جنہوں نے سمندر کو چیر دیا؛ شمشون، جنہیں غیر معمولی جسمانی قوت حاصل تھی؛ اور حضرت داؤدؑ، جنہوں نے ایک دیوہیکل دشمن کو صرف ایک گوپھن اور پتھر سے شکست دی۔

چند صدیوں بعد کے یونانیوں نے بھی اپنے ماضی کی مائسینی تہذیب کے عظیم ترین افسانے اِسی زمانے سے منسوب کیے۔ انہوں نے تصور کیا کہ یہ وہی دور تھا جب بے پناہ طاقت کے حامل ہرکولیس نے بارہ ناممکن مہمات کو ممکن کر دکھایا۔ مائسینیوں نے ممکنہ طور پر ۱۲۵۰ ق م سے ۱۱۸۰ ق م کے درمیان ایشیائے کوچک کے (موجودہ ترکی میں واقع) شہر ٹرائے پر جو حملہ کیا تھا، مائیسینیوں کے جانشین یونانیوں نے اُس حملے کے ساتھ ہیلن آف ٹرائے، ایکی لیز اور یولیسس جیسے غیر معمولی کرداروں کو وابستہ کیا۔ اُسی کہانی

نے اُس افسانے کو بھی جنم دیا جس پر رومن تہذیب نے اپنی بنیاد رکھی، جس کے مطابق ٹرائے سے جان بچا کر نکلنے والے شہزادے اینیس (Aeneas) نے اٹلی میں سکونت اختیار کی اور اُس کی نسل میں رومُولَس پیدا ہُوا جس نے اپنے جڑواں بھائی کی موت کے بعد یا خود اُس کو قتل کر کے شہر روم کی بنیاد رکھی۔

یہ کہانیاں صرف اپنے مناظر یا نتائج کے لیے نہیں بلکہ اِس لیے یاد رکھی گئیں کہ انہوں نے انسانی ارادے کی گہرائی کو ظاہر کیا۔ طاقت، حکمت، وفاداری اور تقدیر کے خلاف مزاحمت وہ آئینے تھے جن میں تہذیبیں خود کو پہچانتی تھیں اور یہ طے کرتی تھیں کہ وہ کیسی بننا چاہتی ہیں۔

ایک نئی قسم کی طاقت

۱۰۰۰ ق م کے لگ بھگ تاریخ اپنے طوفانوں سے گزرنے کے بعد ایک نسبتاً پُرسکون زمانے میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ عظیم سلطنتوں کا زمانہ نہیں تھا۔ بلکہ ایسی چھوٹی بادشاہتوں کا زمانہ تھا جن کے عزائم بڑے تھے۔ بنی اسرائیل اور فونیقی پہلے ہی اِس طرز کا آغاز کر چکے تھے لیکن اب یہ عام ہونے لگا۔

میسوپوٹیمیا میں ایک قدیم شہر اشور (موجودہ عراق میں موصل کے قریب)، جو تہذیب کے ابتدائی دنوں سے موجود تھا، ۹۳۴ ق م کے بعد زبردست اشوری سلطنت کا پایۂ تخت بن گیا۔ اور وہ سلطنت بالآخر جنوب مغربی ترکی سے لے کر شمالی عرب، اور مشرقی مصر سے لے کر مغربی ایران تک پھیل گئی۔ اُس کے بادشاہ بے رحم فاتحین تھے لیکن تجسس سے خالی نہ تھے۔ اشوربانی پال (حکومت: ۶۶۹–۶۳۱ ق م) نے نینوا (موجودہ

عراق) میں قدیم دنیا کی پہلی بڑی لائبریریوں میں سے ایک قائم کی، جس میں ہزاروں مٹی کی تختیاں اکٹھی کی گئیں۔ طاقت کے اُس دور میں علم اور یادداشت کو اِس طرح سراہنا معنی خیز تھا۔

۶۲۶ اور ۶۰۹ ق م کے درمیان اشوری سلطنت تباہ ہو گئی اور اس کے بڑے شہر کھنڈر بن گئے۔ اُسے تباہ کرنے والے دشمنوں میں سے بابل اپنے بادشاہ بخت نصر ثانی کے دَورِ حکومت (۶۰۵ سے ۵۶۲ ق م) میں عظمت کا مرکز بن گیا۔ اُس کے معلق باغات آج بھی ایک افسانوی شہرت رکھتے ہیں اگرچہ اُن کے حقیقی ہونے کے بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔

بنی اسرائیل کی سلطنت جو حضرت سلیمانؑ کے دورِ زریں کے بعد زوال کا شکار ہو چکی تھی اور اپنے نبیوں کی تنبیہات کو نظرانداز کر رہی تھی، بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کردہ عظیم عبادت گاہ جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے، ۵۸۶ ق م میں بخت نصر نے تباہ کر دیا اور بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ تاہم یہ لوگ اُس کی سلطنت میں ضم نہ ہوئے بلکہ ماضی کی یاد اور مستقبل کے بارے میں اُمید کو زندہ رکھا۔

*

یونان میں، جہاں مائسینی دنیا کے زوال کے بعد ایک طویل تاریک دور آیا تھا، ۸۰۰ ق م کے آس پاس آزاد شہری ریاستیں (city-states) اُبھرنے لگیں۔ ان میں ہر ایک اپنے الگ قصے اور شناخت رکھتی تھی۔ عمدگی اور کمال نئی تہذیب کے آئیڈیل تھے اور جسمانی اور ذہنی دونوں میدانوں پر حاوی تھے۔ لہٰذا ۷۷۶ ق م میں یونان کے شہر اولمپیا میں کھیلوں کا آغاز ہُوا جو شہر کی مناسبت سے اولمپک کہلائے۔ ۳۹۴ء تک یہ کھیل ہر

چوتھے برس منعقد ہوتے رہے۔ (اِسی روایت کی یاد میں ۱۸۹۶ء میں جدید اولمپک کھیلوں کا آغاز ہُوا)۔

یونانی ادب کے دو عظیم رزمیے (یعنی عظیم تاریخی نظمیں)، ایلیڈ اور اوڈیسی بھی ایک اندازے کے مطابق ۷۵۰ ق م اور ۷۰۰ ق م کے درمیان لکھے گئے۔ عام طور پر اِنہیں ایک نابینا شاعر ہومر سے منسوب کیا جاتا ہے اگرچہ بعض محققین کو اِس بات میں شبہ ہے کہ ہومر کوئی حقیقی شخص تھا۔ بہرحال یہ دونوں رزمیے پرانی یادوں کو دیومالائی انداز میں پیش کرتے ہوئے یونانی تہذیب کی بنیاد بن گئے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ حیرت انگیز ہے کہ یونانیوں کا ادب انسانی عظمت کے نمونے پیش کرتے ہوئے بھی غیر معمولی طور پر زوال اور ناکامی کے درد میں ڈوبا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔

اِس کی ممکنہ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُس تہذیب کے عظیم ترین شاعروں کے وجدان نے کسی نہ کسی انداز میں اپنی تہذیب کے روحانی انجام کا پہلے سے احساس کر لیا ہو۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ہندومت، پارسی مذہب، یہودیت اور بعد میں آنے والے مذاہب بدھ مت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ کے ماننے والے تو آج بھی دنیا میں موجود ہیں لیکن قدیم میسیوپوٹیمیا، مصر، عرب، یونان اور روم وغیرہ کے مذاہب اب باقی نہیں رہے:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا[1]

جاویدنامہ میں ایک مقام پر اقبال نے اِس بات سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جو مذاہب دنیا سے مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں اُنہیں گویا انسانیت نے خود مسترد کیا ہے کیونکہ وہ انسان کی

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۸۲

اجتماعی روحانی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکے۔[1] یونانی اور رومی مذاہب بھی انہی میں شامل تھے اگرچہ ان دونوں تہذیبوں کے سیاسی، علمی اور فنی پہلو آج بھی کسی دوسری قدیم تہذیب سے بڑھ کر دنیا کو متاثر کر رہے ہیں۔ اِس لیے یونانی شاعری جس کا آغاز ہومر سے ہوا اور اگلے مرحلے پر المیہ ڈراموں کی صورت میں اپنے کمال تک پہنچی، ایک طرح سے اپنی ہی روحانی موت پر مرثیہ بھی تھی۔

یونان ہی کی ایک اور شہری ریاست اسپارٹا میں ۷۰۰ ق م سے ۶۰۰ ق م کے عرصے میں ایسی قوانین نافذ ہوئے جو سخت ڈسپلن برقرار رکھنے، آسائشوں سے دُور رہنے، مَردوں کے لیے عمر بھر کی فوجی تربیت اور سادہ طرزِ زندگی کو فروغ دیتے تھے۔

دُوسری طرف ایک اور شہری ریاست ایتھنز میں، جہاں بادشاہت کے بجائے اشرافیہ کی حکومت (oligarchy) قائم ہو چکی تھی، ۶۲۱ ق م میں اِتنے سخت قوانین نافذ کیے گئے کہ بیس پچیس برس میں خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ۵۹۴ ق م میں ایک اور مجسٹریٹ سولون نے قوانین کی اصلاح کر کے سیاسی عمل میں زیادہ شہریوں کی شمولیت کو ممکن بنا دیا۔

*

سمجھا جاتا ہے کہ انہی صدیوں میں ایران کے کسی حصے میں زرتشت نمودار ہوئے جو پارسی مذہب کے بانی ہیں۔ اُنہوں نے یہ پیغام دیا کہ دنیا میں اچھائی اور برائی کے درمیان کشمکش جاری ہے جس میں ایک بلند اخلاقی کردار کے ذریعے ہی فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ اُن کے مطابق انسان دیوی دیوتاؤں کے کھلونے نہیں بلکہ بااختیار وجود تھے جو روشنی اور تاریکی

[1] اقبال، جاوید نامہ، باب سوم فلکِ زہرہ

میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتے تھے۔ اُن کے نظریات آگے چل کر عظیم ایرانی سلطنت کی بنیاد بھی بنے جس کا ذکر اگلے باب میں آرہا ہے۔

طاسینِ گوتم

اِس دوران میں برصغیر کی ویدی تہذیب (ہندو تہذیب) تاریخ کی مخالف سمت میں بڑھتی رہی تھی۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۶۵۰ق م کے قریب کے زمانے میں (یعنی چوتھے مرحلے کے آغاز پر) آریائی لشکر برصغیر میں داخل ہوئے تھے اور ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی تھی جو اِس مرحلے کے روحانی پیغام کے مطابق چھوٹی چھوٹی اخلاقی ریاستوں پر مبنی تھا۔ پانچ سو برس تک معاشرے کی وہ صحت مند صورت کسی حد تک برقرار رہی جسے قدیم ویدی زمانہ (۱۵۰۰ سے ۱۰۰۰ق م) کہا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں ویدی معاشرہ (ہندو معاشرہ) چار بڑی ذاتوں پر مبنی تھا جو پیشوں کے لحاظ سے طے کی گئی تھیں: برہمن (علمأ اور پجاری)، کشتری (سپاہی اور حکمراں)، ویش (تاجر اور کسان) اور شودر (مزدور اور نوکر چاکر)۔ یہ ذاتیں ایک دوسرے میں ضم ہو سکتی تھیں اور لوگ ایک ذات سے دُوسری میں منتقل ہو سکتے تھے۔

دورِ آخر (۱۰۰۰ سے ۵۰۰ ق م) میں ذات پات کا نظام منجمد ہو چکا تھا اور ذاتیں پیدائش کی بنیاد پر طے ہونے لگی تھیں۔ رسومات اور مذہبی کہانیوں نے اس اونچ نیچ کو مزید مضبوط کیا۔ اچھوت طبقے کا تصوّر بھی پیدا ہو گیا یعنی وہ لوگ جو چاروں ذاتوں سے بھی نیچے سمجھے جاتے تھے۔

اِس کے ساتھ ہی بدترین قسم کی تقدیر پرستی کا تصوّر بھی اُبھر آیا جس کے مطابق انسان کے حالات اُس کے موجودہ عمل کے بجائے اُس کے پچھلے جنم کی وجہ سے متعین ہوتے تھے۔ لہٰذا اپنے حالات بدلنا انسان کے اختیار میں نہیں تھا۔ اُسے اپنے موجودہ حالات کی ناانصافی کو پچھلے جنم کے گناہوں کا نتیجہ سمجھ کر قبول کرنے کی ضرورت تھی تاکہ اگلے جنم میں اُس کے حالات بہتر ہو سکیں۔

ویدی سماج کا یہ اخلاقی زوال چوتھے مرحلے کے رجحانات کی غلط تعبیر کے خطرات سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ اِس مرحلے کے عالمی رجحانات روایت اور یادداشت تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دُوسرے معاشروں میں وہ طاقت اور ترقی کے سرچشمے بنے۔ لیکن برصغیر کی اُس دَور کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اگر روایت اور یادداشت کی اندھی تقلید کی جائے تو اُلٹا نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔ برصغیر میں یہی روایت پرستی ذات پات کے ظالمانہ نظام میں تبدیل ہو گئی۔

اِس لیے اِس سرزمین کی ایک ایسی بڑی شخصیت کو جو تاریخی طور پر اگلے مرحلے میں پیدا ہوئی، ہمیں اِسی مرحلے پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اُس شخصیت کا پیغام برصغیر کے معاشرے کی اِسی خرابی کا حل پیش کرتا تھا۔ اِس لیے وہ پیغام چوتھے مرحلے کے پیغام کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ شخصیت مہاتما گوتم بدھ ہیں۔

*

گوتم بدھ کا پیدائشی نام سِدھارتھ تھا۔ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ۵۶۳ سے ۴۸۳ ق م کے درمیان پیدا ہوئے (اگرچہ کچھ اور تاریخیں بھی تجویز کی گئی ہیں)۔

سدھارتھ نیپال کے ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اُنہوں نے محل

چھوڑ کر برسوں مراقبے اور ریاضت میں گزارے۔ ایک درخت کے نیچے اُنہیں "نروان" حاصل ہُوا جس سے مراد خدا کا نور، باطنی روشنی، نجات کا راستہ، اور مکمل ذہنی اور قلبی سکون ہیں۔ گوتم نے یہ تعلیم دی کہ کسی بھی ذات یا طبقے کا شخص آٹھ اقدامات کے ذریعے نجات حاصل کر سکتا ہے: درست سمجھ، درست ارادہ، درست قول، درست عمل، درست روزگار، درست محنت، درست توجہ اور درست دھیان (مراقبہ)۔

اگرچہ حضرت موسیٰؑ اور گوتم بدھ کے حالات اور پیغامات مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کے درمیان بعض گہری مماثلتیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ دونوں نے محلات میں پرورش پائی اور بعد میں محلات چھوڑ دیئے۔ دونوں کی روحانی زندگیوں میں انقلاب کسی نہ کسی قسم کے درخت کے قریب واقع ہوا یعنی حضرت موسیٰؑ کو جلتی ہوئی جھاڑی کے پاس خدا کی آواز سنائی دی اور گوتم کو درخت کے نیچے نروان حاصل ہوا۔ ان دونوں ہستیوں کی تعلیمات عملی ہدایات پر مشتمل تھیں یعنی حضرت موسیٰؑ کے دس احکامات اور گوتم کے آٹھ اقدامات! دونوں نے اپنے پیروکاروں کو مذہب کے بارے میں خالص فلسفیانہ موضوعات پر بحث کرنے سے روک کر عمل کی طرف راغب کیا۔

البتہ جہاں حضرت موسیٰؑ نے اخلاقی قوت کو ظلم کے خلاف عملی جدوجہد کے لیے استعمال کرنے کی دعوت دی، وہیں گوتم بدھ اُس قوت کا اندرونی اور باطنی رُخ ہیں۔ اِس طرح اگر حضرت موسیٰؑ کے ذریعے ایک زبردست اخلاقی قوت اپنے ماحول کو فتح کرتی دکھائی دیتی ہے تو گوتم بدھ کی صورت میں وہی قوت پوری طرح اپنے باطن کو فتح کرنے کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔

شاید یہ ممکن نہ ہوتا اگر گوتم ایک ایسی تہذیب سے مخاطب نہ ہوتے جو ایک عظیم ورثے کی حامل ہونے کے باوجود مسلسل پانچ صدیوں تک اخلاقی زوال کا شکار ہوتی رہی

تھی۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے، "جب انسان اپنے ماحول کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اُسے قابو میں لا کر ایک نئی صورت دے سکتا ہے۔ لیکن جب ماحول کو تبدیل کرنے کے راستے مسدود ہو جائیں تو وہ اپنے باطن میں ایک عظیم تر دنیا تعمیر کرتا ہے جس میں وہ بے انتہا مسرّت اور وجدان کے سرچشمے دریافت کرتا ہے۔"[1]

گوتم بدھ کا منصوبہ ایسی ہی ایک دنیا کی تشکیل تھا۔

*

یہ بات جاویدنامہ کے پہلے باب میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، وہاں قدیم زمانے کی انسانی تاریخ کو سات مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ وشوامتر کا غار، سروش کی موسیقی اور سروش کی شاعری پہلے تین مراحل کی علامتیں ہیں جنھیں پچھلے ابواب میں واضح کیا گیا۔

سروش کی شاعری سنوانے کے بعد مولانا روم اقبال کو چاند کی ایک وادی میں لاتے ہیں جہاں چار "طواسین" ہیں۔ یہ لفظ طاسین کی جمع ہے جو تصوّف کی ایک اصطلاح ہے اور اُس کے مختلف معانی لیے جاتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ایسی تختیاں ہیں جن پر کوئی پیغام ایک متحرک صورت میں ہو رہا ہے۔

جن چار ہستیوں کے پیغامات اُن میں سے ایک ایک طاسین پر ظاہر ہوتے ہیں وہ ہستیاں گوتم بدھ، زرتشت، حضرت عیسیٰؑ مسیح اور خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں۔

یہاں گوتم بدھ اور زرتشت کو بھی پیغمبروں میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ قرآن کے

---

[1] Iqbal, *Reconstruction*, p.11

مطابق خدا نے ہر بستی میں اپنے پیغمبر بھیجے اگرچہ اُن سب کے نام قرآن میں نہیں آئے ہیں۔ لہٰذا ایران کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے ہدایت دی کہ پارسیوں کے ساتھ اہلِ کتاب کی طرح سلوک کیا جائے۔ سندھ کی فتح کے بعد ہندوؤں اور بُودھوں (یعنی بدھ مت کے پیروکاروں) کے بارے میں بھی اِسی فیصلے کے مطابق عمل کیا گیا۔

لہٰذا اِن تمام مذاہب کے بانیوں کے بارے میں مسلمانوں نے عام طور پر یہی سمجھا ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے خواہ اُن کے پیغامات بعد میں مسخ ہو گئے ہوں۔ گوتم بدھ کو تو بعض مفسرین نے "ذوالکفل" بھی سمجھا ہے جن کا نام قرآن میں کسی تفصیل کے بغیر آیا ہے (انبیا:۸۵؛ اور ص:۴۸)۔

بہرحال جاویدنامہ کے پہلے باب میں چونکہ گوتم بدھ، زرتشت، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضورؐ کے طواسین چونکہ اقبال کے چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں روحانی مشاہدات ہیں اِس لیے اِن چاروں ہستیوں کے پیغامات بالترتیب قدیم تاریخ کے اُن ادوار سے متعلق قرار پاتے ہیں۔ اِس طرح گوتم بدھ کی طاسین قدیم تاریخ کے چوتھے مرحلے سے تعلق رکھتی ہے۔

گوتم بدھ اپنی طاسین پر ایک سادہ مگر گہرا پیغام دیتے نظر آتے ہیں: "غیب کی باتوں میں نہ پڑو، یہ سب وہم و گماں ہیں اور توجہ کے لائق نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بلند ہو جاؤ!"

بگذر از غیب کہ ایں وہم و گمان چیزے نیست
در جہاں بودن و رُستن ز جہاں چیزے ہست [1]

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص۴۹

اِس پیغام کو سننے والی ایک رقاصہ ہے جو اپنی خوبصورتی سے لوگوں کو مائل کرتی رہی ہے لیکن اب توبہ کر رہی ہے۔ وہ گوتم بدھ سے جو درخواست کرتی ہے، اُسے اُس زمانے کے ویدی معاشرے کی فریاد سمجھا جاسکتا ہے: "میرے بیقرار دل کو کشمکش کی مہلت مت دیجیے! اپنے گیسوؤں کی خوبصورتی کچھ اور بڑھا دیجیے!"

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن، گیسوئے تابدار را[1]

دوسروں کو لُبھانے والی لیکن خود ناآسودہ رقاصہ ایک ایسی تہذیب کی علامت ہے جو اپنے ہی سحر میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ جس کے پاس شاعری، روایت اور فلسفہ تو ہے لیکن وہ اخلاقی ترقی سے محروم ہے۔ وہ پکار رہی ہے، "میرے پیروں کی بیڑیاں کھول دیجیے!" یہی پکار وہ لمحہ ہے جب قدیم ویدی تہذیب گوتم بدھ کو جنم دینے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

*

اگر یہ سوال اٹھے کہ کیا اِس سے مرحلوں کی ترتیب متاثر نہیں ہوتی؟ یعنی گوتم بدھ کو چوتھے مرحلے کے بجائے پانچویں مرحلے میں شمار ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ چوتھے مرحلے کے بعد اور پانچویں مرحلے کے شروع میں پیدا ہوئے، تو جواب یہ ہے کہ ہمیں تاریخ کو ایک میکانکی عمل کے طور پر نہیں بلکہ ایک موسیقی کی طرح دیکھنا چاہیے، جہاں ایک ساز

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۵۰۔ اِس شعر کا آزاد ترجمہ اقبال نے اقبال، بالِ جبریل، ص ۸ پر اِس طرح پیش کیا ہے:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!

خاموش ہوتا ہے تو کوئی اور بجنے لگتا ہے۔ یا بعض اوقات سب ایک ہم آہنگی میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اِس لیے باطنی بیداری کا دَور اگلے مرحلے میں شروع نہیں ہو رہا۔ وہ یہاں پہلے ہی خاموشی سے متعارف ہو گیا ہے۔

اِس طرح چوتھے مرحلے کا پیغام جو ماحول پر غالب آنے کی دعوت کے ساتھ شروع ہُوا تھا اپنے باطن پر غالب آنے کے امکان کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ دنیا اب ایک نئے دَور میں قدم رکھنے کے لیے تیار ہے (جو اگلے باب میں بیان ہو رہا ہے)۔

باب ۵

وحدت کی تلاش

۵۵۹ سے ۴ قبل مسیح

جاویدنامہ میں طاسینِ گوتم سے اگلی طاسین زرتشت کی ہے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر ہو چکا ہے، وہ قدیم ایران کے مذہب زرتشتی (پارسی) مذہب کے بانی تھے۔

زرتشت کی طاسین میں دکھایا گیا ہے کہ زرتشت کا سامنا اہرمن سے ہو رہا ہے، جو زرتشتی عقیدے میں مایوسی اور فریب کی رُوح، اور شیطان کے مترادف ہستی ہے۔ اہرمن زرتشت کو دنیا سے کنارہ کش ہونے، انسانوں کو چھوڑنے اور غاروں کی خاموشی میں گم ہو جانے پر اکساتا ہے، اور ترکِ دنیا کے اِس عمل کو پاکیزگی کی معراج بنا کر پیش کرتا ہے: ”شہر کو چھوڑ دو۔ غار نشین ہو جاؤ۔ انسانوں کے بجائے فرشتوں کی صحبت اختیار کرو۔“

شہر را بگذر و غارے نشیں
هم به خیلِ نوریاں صحبت گزیں[1]

زرتشت انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں، ”خود کو ظاہر کرنا، یہی زندگی ہے۔ اپنی قوت کو آزمانا، یہی زندگی ہے“:

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۵۲

خویشتن را وا نمودن زندگی است

ضربِ خود را آزمودن زندگی است![1]

وہ سچائی کے نور کو دیکھ چکے ہیں اور اب اُسے دنیا میں پھیلانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، "تنہائی ابتدا ہے لیکن اجتماعی زندگی تکمیل ہے":

خلوت آغازست و جلوت انتہاست[2]

انسانی تاریخ کے سفر میں یہ طاقت کی اخلاقی بیداری ہے۔

*

اقبال نے زرتشت کی طاسین پر جو کچھ دکھایا ہے، اگر ہم اُس کے مفہوم کو قرآن میں تلاش کریں تو سورۂ کہف (آیات ۸۳ تا ۹۸) میں ذوالقرنین کا کردار ہمارے سامنے آتا ہے۔

سورۂ کہف میں کہا گیا ہے کہ خدا نے ذوالقرنین کو اقتدار دیا اور "تمام ذرائع تک رَسائی" عطا کی۔ جب ذوالقرنین ایک اجنبی علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو خدا اُن سے کہتا ہے، "اے ذوالقرنین! تم چاہو تو ان لوگوں کو سزا دو، یا ان کے ساتھ بھلائی کرو۔" ذوالقرنین کہتے ہیں، "جو ظلم کرے گا ہم اُسے سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا، جو اُسے سخت عذاب دے گا۔ لیکن جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اُس کے لیے بہترین بدلہ ہے، اور ہم اپنے اختیار کے تحت اُس سے ایسی بات کریں گے جو آسان ہو۔"

دنیا کی الہامی کتابوں میں شاید ہی کوئی اور مثال ہو کہ خدا ایک شخص کو حکم نہیں دے

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۵۳

[2] اقبال، جاویدنامہ، ص ۵۴

رہا بلکہ وہ شخص خدا کو بتا رہا ہے کہ وہ کیا کرنے والا ہے، اور خدا اُس کی بات کو کسی ترمیم کے بغیر قبول فرما رہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے؟[1]

خدا اور ذوالقرنین کے درمیان مکالمہ تاریخ کے ایک ایسے مرحلے کی نشاندہی کرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے جہاں انسانیت ایک نئے اخلاقی مقام پر پہنچ چکی ہے اور خود حکمرانی کر سکتی ہے۔ ذوالقرنین کے اِن الفاظ میں، کہ "ہم اپنے اختیار کے تحت اُس سے ایسی بات کریں گے جو آسان ہو" (وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا)، وہ اصول موجود ہے جسے آج ہم عوام کی رضامندی کے ساتھ اُن پر حکومت ("rule by consent") کہتے ہیں۔ یہ ایک نئی سیاسی اخلاقیات کا آغاز ہے، ایک ایسی اخلاقیات جو صرف حاکم ہی نہیں بلکہ محکوم کی مرضی کو بھی اہمیت دیتی ہے۔

*

لیکن تاریخ میں ذوالقرنین کون تھے؟ مفسرین نے اِس پر طویل بحثیں کی ہیں۔ صدیوں تک سکندرِ اعظم (جس کا ذکر اسی باب میں آگے آئے گا) اِس اعزاز کا مستحق سمجھا گیا لہٰذا "سکندر ذوالقرنین" کی اصطلاح اسلامی ادب میں مدّت تک رائج رہی ہے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد بیشتر مفسرین اِس نتیجے پر پہنچنے لگے ہیں کہ ذوالقرنین سے قرآن کی مراد سائرس اعظم ہے، جسے فارسی میں کوروشِ بزرگ اور کوروشِ کبیر کہتے ہیں۔

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۸۱

سائرس کا تعلق زرتشتی مذہب سے تھا اور وہ قدیم ایران کی ہخامنشی سلطنت کا بانی تھا۔ وہ صرف اپنی طاقت کی وسعت ہی نہیں بلکہ انصاف پسندی، رواداری اور مظلوموں کی حمایت کی پالیسی کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔

سائرس نے اندازاً ۵۵۹ سے ۵۳۰ ق م تک حکومت کی۔ اُس کی پیدائش ۶۰۰ ق م یا ۵۷۶ ق م کے قریب موجودہ ایران میں واقع ایک چھوٹی سی ریاست میں ہوئی جہاں اُس کا باپ کمبوجیہ اول حکمراں تھا۔

سائرس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت سنبھالی اور کچھ ہی عرصے بعد (اندازاً ۵۵۰ ق م میں) ہمسایہ ریاست ماد پر بھی قبضہ کر لیا، جو موجودہ ایران کے مغربی حصے پر مشتمل ایک بڑی ریاست تھی۔ اِس طرح اُس نے ہخامنشی سلطنت کی بنیاد رکھی اور بیس پچیس برس میں اِسے پچھلے زمانے کی کسی بھی دوسری سلطنت سے زیادہ وسیع کر دیا۔ چونکہ اِس سلطنت کی ابتدا فارس کے علاقے سے ہوئی تھی (جو موجودہ ایران کا ایک صوبہ ہے، اِس لیے پورا ملک ہی فارس (Persia) کہلانے لگا اور صدیوں تک اس کا یہی نام رہا۔

سائرس نے ملک فارس کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ، وسطی ایشیا اور موجودہ ترکی کے بہت سے علاقے بھی اپنی سلطنت میں شامل کیے۔ بعد میں اُس کے جانشینوں نے اس میں مزید علاقوں کا اضافہ کیا جن میں مصر اور موجودہ پاکستان شامل تھے۔

سائرس کا ایک عجیب و غریب اقدام یہ تھا کہ اُس نے اپنی سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر کے ہر صوبے کے گورنر کو وسیع اختیارات دے دیئے۔ یہ گورنر عام طور پر کوئی مقامی شخص ہوتا تھا۔ اِس طرح ہر صوبہ حقیقت میں ایک نیم خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہ انسانی تاریخ میں اُس تصوّر کی ایک گہری بنیاد تھی جو مزید ترقی کرنے کے بعد اب

علاقائی خود مختاری، وفاقی ڈھانچے، اور بین الاقوامی ریاستی اتحاد (جیسے یورپی یونین) کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

۵۳۹ق م میں سائرس نے بابل فتح کیا اور کہا جاتا ہے کہ شہریوں نے مزاحمت کرنے کے بجائے اُس کا زبردست استقبال کیا۔ صدیوں بعد ۱۸۷۹ء میں اُس شہر کے کھنڈرات سے سائرس کے زمانے کا ایک مٹی کا سیلنڈر برآمد ہُوا جس پر سائرس کی پالیسی درج ہے جو انسانی ہمدردی اور مذہبی رواداری پر مبنی ہے، چنانچہ اقوامِ متحدہ کے صدر دفتر میں اِس کی ایک نقل انسانی حقوق کے اولین منشور کے طور پر رکھی گئی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ بخت نصر ثانی نے یروشلم کو برباد کرنے کے بعد یہودیوں کو بابل میں قید کر دیا تھا۔ سائرس نے اُن یہودیوں کو یروشلم واپس جانے کی اجازت دے دی، اور ہیکلِ سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنے میں اُن کی مدد کی۔

لیکن یہ تاریخ کی ایک عجیب ادا ہے کہ سائرس کی اِس بے پناہ اہمیت کے باوجود اُس کی اپنی ذات کے بارے میں مصدقہ معلومات بہت کم ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات بھی یقینی طور پر کسی کو معلوم نہیں ہے کہ سائرس کی موت کہاں اور کس طرح واقع ہوئی۔ اقبال نے شیکسپئیر کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ سائرس پر بھی صادق آتی ہے کہ جب تمہارے دیدار کی خواہشمند آنکھوں نے تمہیں تلاش کرنا چاہا تو سورج کو اپنی روشنی میں چھپا ہوا پایا:

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں پایا[1]

سورج کی مانند سائرس کو براہِ راست دیکھنا ممکن نہیں لیکن اُس کی روشنی اُس کے عہد کی ہر شے کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اُس روشنی میں ہمیں تین رجحانات پانچویں مرحلے میں دنیا بھر

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۲۸۳

میں اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اول، یہ سوال کہ ایک مثالی حکمراں کیسا ہونا چاہیے؟ دوم، انسان میں چھپے ہوئے امکانات کا ظہور اور ہمیشہ رہنے والے آئیڈیلز کی تشکیل۔ اور تیسرا رجحان ہے، چوتھے اور پانچویں مرحلے کے پیغامات کا بعض جگہوں پر ایک نغمے کے مختلف سازوں کی طرح ہم آواز ہو جانا۔

اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ سب کچھ براہ راست سائرس کے اثر سے ہو رہا تھا۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ انسانیت اپنی ترقی کے سفر میں ایک مخصوص مقام پر آن پہنچی تھی اور سائرس کا ظہور اُس مقام کے تقاضوں کے ساتھ اِس طرح ہم آہنگ ہُوا کہ وہ اُن تمام تقاضوں کے لیے ایک بہترین حوالہ بن گیا:

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردُوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک پر تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رَسا دیکھ![1]

سائرس کا عہد

جہاں تک چوتھے اور پانچویں مرحلے کے پیغامات کے ہم آواز ہو کر سنائی دینے کی مثالوں کا تعلق ہے، پچھلے باب میں آپ گوتم بدھ اور اُن کے پیغام سے واقف ہو چکے ہیں، جو غالباً نیپال میں سائرس کے عہد یا اس کے فوراً بعد پیدا ہوئے۔ لیکن اُن کے پیغام کا ایک پہلو

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۷۸

پانچویں مرحلے کے بنیادی سوال یعنی مثالی حکمراں کی خصوصیات سے بھی تعلق رکھتا ہے کیونکہ اُن کی ابتدائی تعلیمات میں ایک مثالی حکمراں کو چکرورتی (''پہیہ گھمانے والا'') بادشاہ کہا گیا ہے، یعنی ایک ایسا صالح فرمانروا جو جبر کے ذریعے نہیں بلکہ دھرم (انصاف، رحم اور سچائی پر مبنی ایک آفاقی اخلاقی نظام) کے ذریعے حکومت کرتا ہے۔

یہی رجحان مہاویر کی ابتدائی تعلیمات میں بھی دکھائی دیتا ہے، جو جین مت کے بانی تھے اور اُسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندوستان کی دو عظیم رزمیہ داستانیں، والمیک کی رامائن اور ویاس کی مہابھارت، بعض اندازوں کے مطابق سائرس کے دو سو برس کے اندر اندر مرتب ہوئیں۔ چین کی شہرۂ آفاق تصنیف ''فنِ حرب'' (*The Art of War*) بھی اُسی عہد میں لکھی گئی اور اُس ملک کا سب سے مشہور فلسفی کنفیوشس (۵۵۱ سے ۴۷۹ ق م) بھی اُسی زمانے میں گزرا ہے۔

ہمیں اِن سب میں چوتھے اور پانچویں مرحلے کے پیغامات کا سنگم نظر آتا ہے۔ کیونکہ اِن سب میں چوتھے مرحلے کے مخصوص موضوعات، جیسے پارسائی، فرض، شناسی، روایت کی پاسداری اور معاشرتی درجہ بندی کے احترام کو پانچویں مرحلے کے تقاضوں، بالخصوص مثالی حکمراں کی دریافت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

البتہ چینی فلسفی اور مذہبی رہنما لاؤزی (جو اندازاً اُسی صدی میں گزرے ہیں) کی تعلیمات ان میں سے کسی بھی مرحلے سے تعلق نہیں رکھتیں کیونکہ اُن میں فطرت کے ساتھ داخلی طور پر ہم آہنگی کی دعوت تو موجود ہے لیکن عمل کی طرف کچھ بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

*

اِسی دوران میں فارس میں سائرس کے جانشینوں میں دارائے اول (جنہیں دارائے اعظم بھی کہا جاتا ہے)، سب سے زیادہ ناموری حاصل کر چکے تھے یہاں تک کہ بعد کی اسلامی شاعری میں بھی اُن کا نام شان و شوکت اور بادشاہی کی علامت بنا رہا:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا[1]

۵۱۸ ق م کے قریب دارا نے موجودہ پاکستان کے بہت سے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ ان علاقوں کے بارے میں تقریباً دو صدی بعد ایک یونانی سپہ سالار نیارکس نے لکھا کہ یہاں سادگی، دیانت، شجاعت اور سچ بولنے کی عادت عام ہے، حتیٰ کہ "سب آزاد ہیں اور کوئی بھی غلام نہیں ہے۔" عین ممکن ہے کہ یہ دو صدیوں پر محیط ہخامنشی اثرات کا نتیجہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ ایک سلطنت کے مثبت اثرات کی منفرد مثال ہے۔

*

دوسری طرف اطالوی جزیرہ نما میں رومیوں نے ۵۰۹ ق م میں اپنے آخری بادشاہ کو معزول کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اقدام اُس وقت اٹھایا گیا جب ایک معزز عورت نے بادشاہ کے لڑکے کی دست درازی کے بعد خودکشی کر لی۔ اُس عورت کے ایک رشتہ دار نے اُس کے جسم سے خنجر نکال کر قسم کھائی کہ آیندہ کوئی بادشاہ روم پر حکومت نہیں کرے گا۔

اِس طرح رومن ری پبلک (جمہوریہ) کی بنیاد پڑی۔ یہ ایک نیا سیاسی نظام تھا جو اجتماعی حکمرانی اور عوامی احتساب پر قائم تھا اگرچہ ابتدا میں یہ عام شہریوں کے بجائے صرف

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۲۹

اشرافیہ کے مفاد میں تھا۔

پہلی دو تین صدیوں تک رومن ریاست کا دائرہ وسطی اٹلی میں روم شہر کے گرد و نواح تک محدود تھا لیکن آہستہ آہستہ اٹلی کے دوسرے علاقوں تک پھیل گیا۔ اس نظام میں ایک سینیٹ اور دو سربراہان ہوتے تھے جنہیں کونسل کہا جاتا تھا اور جو ایک سال کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔

*

کم و بیش اُسی زمانے میں یونان کی شہری ریاست ایتھنز نے ۵۰۸–۵۰۷ ق م میں اشرافیہ کی حکومت (oligarchy) کو ختم کر کے ایک نئے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی جس کے لیے کچھ عرصے بعد ڈیموکریسی (جمہوریت) کا لفظ رائج ہو گیا۔ اِس کا لفظی مطلب ''عوام کی حکمرانی'' تھا۔

یہ نظام اِس طرح وجود میں آیا کہ ایتھنز کے ایک سیاسی لیڈر کلیس تھینیز (Cleisthene) نے ''قبیلے'' کا تصوّر بدل دیا۔ اُس نے نسلی رشتوں پر مبنی قبائل کے بجائے نئے قبائل تشکیل دیئے جن میں سے ہر قبیلے میں مختلف علاقوں اور مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والے شہری شامل تھے۔ اِسی طرح کے دُوسرے اقدامات کر کے کلیس تھینیز نے نسلی اور علاقائی سوچ کی جڑیں کاٹ دیں۔

اگرچہ اس نظام میں بہت سی خامیاں بھی تھیں، مثلاً عورتیں اور غلام شہری حقوق سے محروم تھے۔ لیکن پھر بھی ایک عظیم سیاسی آئیڈیل کی بنیاد رکھ دی گئی۔

رومن ری پبلک کے برعکس جمہوریت کے تصوّر میں الیکشن، سیاسی جماعتوں اور پیشہ ور سیاستدانوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ صرف چند عہدوں کے لیے کسی خاص وجہ سے

الیکشن ہوتے تھے ورنہ باقی تمام نشستیں اور عہدے قرعہ اندازی کے ذریعے طے پاتے تھے۔ ''اسمبلی'' (یعنی پارلیمنٹ) حقیقت میں ایک عام مجلس تھی جہاں تمام شہری مل کر قانون اور پالیسی کا فیصلہ کرتے تھے۔ یونان میں موجود تقریباً ایک ہزار ریاستوں میں سے نصف نے کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت اختیار کرلی۔

*

لیکن یونانی تہذیب اور سیاست کا حقیقی عروج فارس سے ٹکراؤ کے بعد شروع ہوا۔ اس تصادم کے کئی مناظر تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، جیسے میراتھن کی جنگ میں فتح کی خبر سنانے والا قاصد، جو چالیس کلومیٹر دوڑ کر آیا۔ اُسی کے نام پر آج طویل دوڑوں کو میراتھن کہا جاتا ہے۔

۴۸۰ ق م میں، ایتھنز کی قیادت میں یونانی بحری بیڑے نے فارس کے شہنشاہ خشایارشا کو سلامس کی جنگ میں شکست دی۔ لیکن اس سے پہلے اسپارٹا کے بادشاہ لیونیڈس اور اُس کے تین سو سپاہی اپنی جانیں قربان کرچکے تھے، اور خشیارشیا ایتھنز شہر کو نذرِ آتش کرچکا تھا۔ اگلے برس فیصلہ کن شکست کے بعد فارس پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔

اُس کے بعد جلد ہی یونان کی شہری ریاستوں میں پھوٹ پڑ گئی اور اگلے سو ڈیڑھ سو برس تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتی رہیں۔

لیکن خاص بات یہ ہے کہ تمام نااتفاقی کے باوجود یونانیوں میں ایک مشترکہ تہذیب کے وارث ہونے کا احساس دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ اُنہوں نے بیرونی دنیا کو کم مہذب سمجھنا شروع کردیا۔ یونانی زبان کا لفظ 'بارباروس' جو پہلے صرف غیر یونانی زبان بولنے والوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، اب 'جاہل' یا 'وحشی' کے معنوں میں آنے لگا۔ یہی لفظ انگریزی میں 'باربیرین' (barbarian) بنا اور اِسی نے فارسی لفظ ''بربریت'' کو جنم دیا جسے آج ہم اُردو

میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

آپس کی جنگوں کے باوجود ایک مشترکہ شناخت پر فخر کرنے کا جذبہ یونان میں اِس لیے پروان چڑھا کہ وہاں سیاست، کھیل، ڈرامہ، فنِ تعمیر اور تاریخ نویسی سمیت زندگی کے تمام شعبے عوامی تشخص کو فروغ دینے کے مقصد سے جُڑ گئے تھے۔

سیاست کے میدان میں اُس زمانے کی سب سے نمایاں شخصیت ایتھنز کا سیاستدان اور جنرل پیریکلز (۴۹۵ سے ۴۲۹ ق م) تھا۔ ڈرامے کے فن میں دنیا کے چار عظیم ترین ڈرامہ نگار اُسی زمانے میں یونان میں منظرِ عام پر آئے۔ یہ ایسکائلس، یوری پیڈیز، سوفوکلیز اور آریسٹوفینیز تھے، جن کے بنائے ہوئے کردار اور کہانیاں آج بھی زندہ ہیں۔ اُس دَور کے فنِ تعمیر کے عظیم نمونوں میں ایتھنز کا پارتھینن (دیوی ایتھینا کا مندر) اور ہالی کارناسس کے گورنر موسولس کا مقبرہ شامل ہے، جس سے انگریزی لفظ ماؤسولیم (mausoleum) نکلا ہے۔ اِسی طرح مجسمہ سازی کے فن نے بھی اِتنی ترقی کر لی کہ مجسمے بالکل جیتے جاگتے انسانوں جیسے دکھائی دینے لگے۔

اُسی زمانے میں ہیروڈوٹس (۴۸۴ سے ۴۲۵ ق م) کی لکھی ہوئی کتاب علمِ تاریخ کی بنیاد سمجھی جاتی ہے (انگریزی کا لفظ "ہسٹری" دراصل اِسی کتاب کے عنوان سے آیا ہے)۔

اُس کتاب میں سائرس کے حالاتِ زندگی بھی بیان ہوئے جنہیں فوراً ہی فارس کے شاہی دربار میں موجود یونانی طبیب کتیسیاس (Ctesias) نے چیلنج کر دیا لیکن بدقسمتی سے کتیسیاس کی اپنی لکھی ہوئی کتاب اب تقریباً ضائع ہو چکی ہے۔

سائرس کے موضوع پر جس شخص کی لکھی ہوئی کتاب نے آیندہ نسلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سپاہی اور فلسفی زینوفون (۴۳۰ سے ۳۵۴ ق م) تھا۔ اُس نے 'سائروپائڈیا' (یعنی 'سائرس کی تعلیم و تربیت') کے عنوان سے سائرس کی ایک افسانوی سوانح عمری

لکھی۔ اصل مقصد عوام کو حکومت اور رہنمائی کے اصول سکھانا تھا تاکہ ہر شہری اِن اصولوں پر دسترس کر کے بہترین طور پر حکومت کرنے کے قابل ہو سکے۔ زینوفون نے اِس مقصد کے لیے سائرس کو منتخب کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ "سائرس وہ حکمران تھا جس کی رعایا اُس کی حکمرانی پر سب سے زیادہ خوشی سے راضی تھی، اور وہ نہایت کامیابی سے حکومت کرتا تھا۔"

ہیروڈوٹس اور کتیسیاس دونوں نے سائرس کی موت میدانِ جنگ میں بتائی تھی لیکن زینوفون کی کتاب میں وہ بسترِ مرگ پر قدرتی طور پر وفات پاتا ہے اور جاتے جاتے انسانیت یہ پیغام دیتا ہے:

> رفتہ رفتہ تبدیلی ہر مخلوق کو مکمل تبدیلی سے ہمکنار کر سکتی ہے؛ اور یہ سبق ہمیں خدا سکھاتا ہے، جو ہمیں آہستہ آہستہ سردیوں سے نکالتا ہے، یہاں تک کہ ہم شدید گرمی کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں، اور گرمی سے نکال کر پھر سردیوں کی گہرائی میں لے آتا ہے۔ لہٰذا، ہمیں خدا کی پیروی کرنی چاہیے، اور ایک ایک قدم اٹھاتے جانا چاہیے، یہاں تک کہ ہم اپنی منزل کو پالیں۔

دُوسری طرف علمِ ہندسہ، طب، اور فلسفے کے ماہرین اُن فنون کو ایک منظم شکل دینے میں مصروف تھے۔ فیثاغورث کی تھیورم اور دیموقراطیس کا ایٹمی نظریہ آج بھی بچے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بقراط نے طب کی سائنسی بنیاد رکھی اور اُن سے منسوب عہد کی بعض سطور آج بھی اُس حلف میں شامل ہوتی ہیں جو ڈاکٹر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے پیشے کا آغاز کرنے سے پہلے اُٹھاتے ہیں، مثلاً "مَیں اپنے علم سے اپنی استطاعت اور بصیرت کے مطابق مریضوں کی مدد کروں گا لیکن کبھی اِسے مریضوں کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال میں نہیں لاؤں گا۔"

لیکن اُس عہد کے مفکروں میں سب سے زیادہ شہرت سقراط (۴۷۰ سے ۳۹۹ ق م) کو حاصل ہوئی جس نے عوام کو مکالمے اور سوال و جواب کے ذریعے سچ تک پہنچنے کا طریقہ سکھانے کی کوشش کی۔ اُس پر الزام لگا کہ وہ نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے اور دیوی دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے، اور اِس جرم میں اُسے زہر کا پیالہ پینے کی سزا دی گئی۔

سقراط کے شاگرد افلاطون (۴۲۳ سے ۳۴۷ ق م) کے فلسفے نے صدیوں تک دنیا کی تہذیبوں کو متاثر کیا۔ اُس کی تقریباً تمام تصانیف مکالمات کی صورت میں ہیں، جن میں سقراط مرکزی کردار ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقی واقعات نہیں ہیں بلکہ جس طرح زینوفون کی سائروپائڈیا ایک تخیلاتی سوانح عمری تھی، ویسے ہی افلاطون کے مکالمات بھی دراصل اپنے بعض خیالات کو پیش کرنے کا ذریعہ ہیں۔ زینوفون اور افلاطون کا موضوع ایک ہی تھا یعنی مثالی حکمرانی کا تصوّر لیکن اُن کے نظریات ایک دُوسرے کی مکمل ضد تھے۔

افلاطون نے مثالی ریاست کا یہ تصوّر پیش کیا کہ وہاں لوگ تین طبقوں میں بٹے ہوں گے: اول، حکمراں؛ دوم، جنگجو اور منتظم؛ اور سوم، محنت کش (کاشتکار، تاجر، وغیرہ)۔ کسی شہری کو کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے سوائے اُن حقوق کے جو حکمراں اپنی مرضی سے طے کر دیں گے۔ خاندانی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہو گا۔ مَردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ فارموں میں رکھا جائے گا۔ حکمراں جب مناسب سمجھیں گے، اپنی مرضی سے کسی بھی مرد اور کسی بھی عورت کو منتخب کر کے دونوں کو اکٹھا چھوڑ دیں گے تاکہ وہ بچہ پیدا کر دیں۔ بچے کی پیدائش ہوتے ہی اُن مرد و عورت کو واپس اُن کے فارموں میں بھیج دیا جائے گا، اور بچے کو ریاست اپنی نگرانی میں پرورش دے گی۔ اِس طرح کسی بچے کو معلوم نہ ہو گا کہ اُس کے والدین کون ہیں، اور والدین کو اپنے بچوں کا علم نہ ہو گا۔ نہ صرف محبت بلکہ شادی پر بھی پابندی ہو گی۔ اگر کوئی مرد و عورت یہ جرم کریں تو اُنہیں سخت سزا دی

جائے گی اور اِس قسم کے تعلق سے پیدا کرنے والے بچے کو ریاست میں نہیں رکھا جائے گا۔ ہومر جیسے عظیم شاعر کے کلام سمیت شاعری کی اکثر اصناف اور ڈرامے پر پابندی ہو گی۔ باقی فنون پر ریاست کڑی نظر رکھے گی کہ وہ ریاستی نظام پر کوئی سوال نہ اُٹھا سکیں۔

اِس بیہودگی کو افلاطون نے چکنی چپڑی فلسفیانہ زبان میں پیش کیا، جن میں سب سے مشہور اُس کا نظریۂ اعیان (Theory of Ideals) ہے۔ آسان الفاظ میں اِس نظریے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جس دنیا کو دیکھتے ہیں وہ اصل نہیں ہے بلکہ کسی اعلیٰ اور کامل 'مثال' کی ناقص نقل ہے، جو ہمارے حواس سے باہر ہے۔

اِس طرح افلاطون کا پیغام دراصل وہی ہے جو طاسینِ زرتشت پر اہرمن زرتشت کو گمراہ کرنے کے لیے پیش کر رہا ہے: "شہر کو چھوڑ دو۔ غار نشین ہو جاؤ۔ انسانوں کے بجائے فرشتوں کی صحبت اختیار کرو۔"

بدقسمتی سے افلاطون کا فلسفہ دنیا کی کئی تہذیبوں کو متاثر کرتا رہا ہے، جس میں اسلامی تہذیب بھی شامل ہے۔ لہٰذا اقبال نے بالکل واضح الفاظ میں اُس کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے، "افلاطون کی فکر نے نقصان کو نفع قرار دے دیا۔ اُس کے فلسفے نے موجود کو غیر موجود قرار دے دیا۔ قومیں اُس کے نشے کے زہر کی شکار ہو گئیں، سو گئیں اور عمل کے ذوق سے محروم ہو گئیں":

فکر افلاطوں زیاں را سود گفت　　　حکمتِ او بود را نابود گفت
قومہا از سکرِ او مسموم گشت　　　خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت [1]

افلاطون کی اِس زوال انگیز سوچ کو اُس کے شاگرد ارسطو (۳۸۴ سے ۳۲۲ ق م) نے چیلنج کیا۔ ارسطو انسانی تاریخ کا پہلا مفکر ہے جس نے علم کو ایک مربوط، اُصولی اور منظم طریقے

[1] اقبال، اسرار و رموز، ص ۳۶-۳۵

سے ترتیب دینے کی شعوری کوشش کی تاکہ ہر موضوع کو اُس کی نوعیت کے مطابق سمجھا اور سکھایا جاسکے۔ سائنس سے لے کر رُوحانیت اور فلسفے سے لے کر فنونِ لطیفہ تک انسانی علم کے تقریباً ہر شعبے میں اُسی کی کوئی نہ کوئی تصنیف صدیوں تک سند قرار دی جاتی رہی۔ اُس کا علمی ورثہ اسلامی، مسیحی اور مغربی فکر کو دو ہزار سال سے زیادہ عرصے تک متاثر کرتا رہا ہے لہٰذا اسلامی تہذیب میں اُسے ''معلمِ اوّل'' کا لقب دیا گیا ہے۔

سکندر سے اشوک تک

اُس وقت یونانی تہذیب ایک نازک صورتحال سے دوچار تھی۔ باہر سے فارسی سلطنت کا دباؤ تھا، داخلی طور پر نااتفاقی بڑھ رہی تھی اور کلیس تھنیز کا جمہوری آئیڈیل بھی رفتہ رفتہ ماند پڑ چکا تھا۔

ایسے میں مقدونیہ کی نیم وحشی سرحدی ریاست کے بادشاہ فِلپ دوم نے اپنی فوج کو از سرِ نو منظم کیا اور ۳۳۷ ق م میں یونانی ریاستوں کو ایک پیچین اتحاد کے ذریعے اپنی قیادت میں اکٹھا کر لیا۔ اس اتحاد کا مقصد فارس کے خلاف جنگ چھیڑنا تھا لیکن اس کے فوراً بعد فِلپ قتل کر دیا گیا۔

فلپ کا بیس سالہ بیٹا سکندر (Alexander) اُس کے منصوبے کو لے کر آگے بڑھا۔ اُس نے فارس کے آخری شہنشاہ دارا سوم کو شکست دے کر فارس کو فتح کیا۔ لیکن اُس کے بعد بھی وہ مسلسل مشرق کی جانب بڑھتا رہا اور اُن علاقوں تک جا پہنچا جن کا یونانیوں کو بمشکل ہی علم تھا۔ اُن میں موجودہ پاکستان بھی شامل ہے۔ جب سکندر کی تھکی ماندہ فوج نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تو وہ واپس لوٹا اور جلد ہی بابل میں وفات پا گیا۔ اُس کی عمر تینتیس برس سے کچھ ہفتے کم تھی۔

آج سکندرِ اعظم کے نام سے یاد کیا جانے والا یہ شخص تاریخ میں محض ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک علامت کے طور پر زندہ ہے۔

یونانی داستانوں کے ہیروز کی طرح اُس کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ وہ زیوس کا بیٹا ہے۔ میدانِ جنگ میں بے خوفی اور یہاں تک کہ اپنے سپاہیوں سے آگے بڑھ کر حملہ کرنا، اور شکار کے دوران شیر سے تنہا مقابلہ کرنا، یہ سب باتیں اُسے یونانیوں کی نظر میں اُن کے ہر آئیڈیل کی عملی مثال بناتی تھیں، چاہے وہ آئیڈیل کتنا ہی غیر حقیقی کیوں نہ ہو۔

یہ سب محض اتفاق نہیں تھا۔ سکندر نے ارسطو کے زیرِ تربیت تعلیم حاصل کی تھی، ہومر کو دل و جان سے پڑھا تھا اور سائرس کو ہیرو سمجھا تھا، خاص طور پر زینوفون کی کتابوں کی روشنی میں! اُس کا قول تھا، ”عظمت کی قیمت محنت اور خطرہ ہے؛ مگر یہ زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے جب اسے حوصلے کے ساتھ گزارا جائے اور ایک ایسا نام چھوڑ کر مرا جائے جو کبھی نہ مٹے۔“

اگرچہ اُس نے بھی اپنے دور کے جنگی رواج کے مطابق قتل و غارت کی لیکن مجموعی طور پر وہ مفتوح قوموں کے ساتھ سلوک میں سائرس کی تقلید کی کوشش کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ایک مشہور مثال راجہ پورس کے حوالے سے ہے، جو موجودہ پاکستان کے جہلم کے علاقے کا حکمران تھا اور ایک بھرپور جنگ میں سکندر کی فوج کو بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گرفتار ہُوا۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر نے اُس سے پوچھا، ”تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟“ پورس نے جواب دیا، ”جیسا ایک بادشاہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔“ سکندر نے اِس جواب کے وقار کو تسلیم کرتے ہوئے پورس کی بادشاہت بحال کر دی اور مزید علاقے بھی اُس کی نگرانی میں دے دیے۔

سکندر کی موت کے فوراً بعد اُس کی سلطنت بکھر گئی لیکن سلطنت کے بکھرنے کی وجہ

سے یونانی تہذیب کے بیج زیادہ دُور تک پھیل گئے اور خود سکندر کا نام بھی!
بعد میں کئی صدیوں تک مسلمانوں نے سکندر کو ذوالقرنین سمجھا، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اُس کا نام اُن چند ناموں میں شامل ہو گیا جنہیں کئی مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے لوگ اپنے بچوں کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں۔

*

سکندر کی وفات کے بعد کے سو برس میں دنیا کے کئی خطوں میں قدرتی طور پر عظمت کی چنگاریاں اچانک پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔
براعظم امریکہ میں، جو اُس وقت باقی دنیا سے کٹا ہوا تھا، مایا تہذیب نے تقریباً ۳۰۰ ق م میں اپنی تقویم یعنی کیلنڈر کے نظام کو ترقی دینا شروع کیا۔ یہ وقت ناپنے کا ایک نہایت ترقی یافتہ نظام بن گیا جس نے ہمارے زمانے میں بھی خاصی شہرت پائی ہے کیونکہ بعض لوگوں نے غلط طور پر یہ سمجھا کہ یہ ۲۰۱۲ء میں دنیا کے خاتمے کی پیش گوئی کرتا ہے۔
افریقہ میں، فونیقی باشندوں کی آباد کردہ ریاست قرطاجنہ (جو موجودہ ریاست تونس کے دارالحکومت کے قریب واقع تھی)، اُسی زمانے میں اپنے سنہری دور میں داخل ہوئی۔
برطانیہ اور گال میں (جو موجودہ فرانس، بلجیم اور دیگر یورپی ممالک کے حصے پر مشتمل علاقہ تھا)، ۲۵۰ ق م کے آس پاس ابتدائی کیلٹ بادشاہتیں ابھرنا شروع ہوئیں جو مقامی شناخت اور ثقافتی حافظے کی بنیاد بنیں۔
برصغیر میں چندر گپت موریہ (حکمرانی: ۳۲۱ سے ۲۹۸ ق م) نے ایک عظیم سلطنت قائم کی جو شمالی ہند سے لے کر بنگال اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کا پایۂ تخت پاٹلی پتر (آج کا پٹنہ)، اُس وقت ریاست مگدھ کا حصہ تھا (جو تقریباً موجودہ بہار کے علاقے پر

محیط تھی)۔

چندر گپت کا سیاسی نظریہ ارتھ شاستر نامی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، جسے اُس کے مشیر اور اُستاد چانکیہ سے منسوب کیا جاتا ہے (چانکیہ کے لیے کوٹلیہ اور وِشنو گپت کے نام بھی تجویز کیے جاتے ہیں)۔ اس کتاب میں مثالی حکمران کا تصوّر اِس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ سمجھدار اور نظم وضبط پر کاربند لیکن اخلاقی ضابطوں اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ سخت سزاؤں، کمزور ریاستوں پر حملوں اور پُر فریب سفارت کاری کے ذریعے ایک مضبوط، مرکزیت پسند بادشاہت قائم کرتا ہے۔ یہ نظام عوام کی رضا سے زیادہ اپنے سفاک حکمراں کی منصوبہ سازی پر منحصر ہوتا ہے۔

اِس نظام نے بظاہر برصغیر کے ایک بہت بڑے حصے کو متحد کر دیا لیکن یہ اتحاد اندر سے کھوکھلا تھا۔ جیسا کہ صدیوں بعد ۱۹۱۷ء میں عظیم ہندوستانی رہنما سی آر داس نے کہا: "کیا آپ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایسا لمحہ دکھا سکتے ہیں جب ہندوستان متحد تھا؟ مجھے تو کوئی نہیں ملا۔" داس نے موریہ سلطنت کو قومیتوں کے اتحاد کے بجائے صرف مگدھ ریاست کا برصغیر کی دوسری ریاستوں پر غلبہ قرار دیا لیکن ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہا، "ہندوستان کی تاریخ کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہر کامیابی، ہر ناکامی، ہر فتح، ہر شکست کے ذریعے ہندوستان اپنی تقدیر کی تشکیل کر رہا تھا اور رفتہ رفتہ اپنی روح کو ظاہر کر رہا تھا۔"[1]

*

شاید ہندوستان کی اُسی روح نے حکمرانوں کے ضمیر میں اپنی آواز بلند کی۔

چندر گپت نے اپنے آخری دنوں میں تاج و تخت چھوڑ دیا اور مہاویر کے پیش کیے

1

ہوئے عدم تشدد پر مبنی جینی مذہب کو اپنا کر ترکِ دنیا اختیار کیا۔

دو دہائیوں بعد اقتدار اُس کے پوتے اشوک (حکمرانی ۲٦۸ سے ۲۳۲ ق م) تک پہنچا جس نے دوسرے حکمرانوں کی طرح اپنی حکومت کا آغاز کیا لیکن ایک بڑی جنگ میں فتح پاتے ہوئے قتل وغارت اور خونریزی کی شدّت نے اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ تب وہ گوتم بدھ کی روح کی طرف متوجہ ہوا اور وہی کیفیت محسوس کی جو جاوید نامہ کی طاسینِ گوتم پر تائب رقاصہ محسوس کر رہی ہے۔ "آپ نے مجھے بلند فطرت عطا کی ہے۔ اب میرے پاؤں کی زنجیر کھول دیجیے تاکہ میں شاہی خلعت اُتار کر درویشی کا لباس پہن سکوں":

طبعِ بلند دادہ ئی، بند زپائے من کشائے
تا بہ پلاسِ تو دہم خلعتِ شہریار را[1]

اشوک بھی بدھ مت کا پیروکار بن گیا۔ اُس نے اپنی وسیع سلطنت میں جگہ جگہ ستونوں اور پتھر کے کتبوں پر جو فرمان نقش کروائے، وہ قدیم دنیا میں ابلاغِ عامہ (mass media) کی ایک دلچسپ مثال ہیں۔ اُن میں اشوک رحم، عدم تشدد، اخلاقی ضبط، سب مذاہب کے لیے رواداری، اور قیدیوں، خدام اور جانوروں تک کے لیے ہمدردی کی تلقین کرتا سنائی دیتا ہے۔

اشوک کی تبلیغی کوششوں کے ساتھ ہی بدھ مت سری لنکا پہنچا اور آیندہ چھ سات صدیوں میں وسطی ایشیا، چین، جنوب مشرقی ایشیا اور جاپان تک پھیلتا چلا گیا۔ اِس طرح اِس نے وہ سفر طے کیا جس کی وجہ سے اِسے ہمارے زمانے میں یہ منفرد حیثیت حاصل ہے کہ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے اداروں سے زیادہ اپنے پیغام کی رُوح سے پہچانا جاتا ہے اور جس کے ماننے والے کروڑوں لوگوں میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی

[1] اقبال، جاوید نامہ، ص ۵۱

شامل ہے جو اِسے ایک باقاعدہ مذہب کے طور پر قبول کیے بغیر بھی اِس کی اخلاقی تعلیمات کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بے سہارا دنیا

اشوک کی وفات (تقریباً ۲۳۲ قبل مسیح) کے بعد موریہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ خاص طور پر شمال مغربی علاقوں (یعنی موجودہ پاکستان اور افغانستان) میں مقامی طاقتیں تیزی سے ابھریں، وفاداریاں بدلتی رہیں، اور کوئی پائیدار حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اُدھر دکن کے پہاڑی میدانوں میں بھی نئی سلطنتیں سر اٹھانے لگیں، جن میں ستواہن خاندان قابلِ ذکر ہے۔

لیکن ہمالیہ کے اُس پار چین ایک طویل انتشار کے دَور سے نکل کر دوبارہ یکجہتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ۲۲۱ ق م میں شی ہوانگ کے تحت اس ملک نے پہلی بار ایک متحد سلطنت کی صورت اختیار کی۔ شمالی سرحدوں پر خانہ بدوش حملہ آوروں سے بچاؤ کے لیے اس نے اُس دیوار کی تعمیر شروع کی جو بعد میں "دیوارِ چین" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُس دور کے اقدامات اگرچہ مؤثر تھے مگر ظالمانہ بھی تھے۔

یہ سختی بعد میں ہان خاندان کے دور میں کچھ کم ہوئی جب ۲۰۶ قبل مسیح میں ایک نئی سلطنت برسرِ اقتدار آئی۔ اُس دَور میں کنفیوشس کے اخلاقی اصولوں کو ریاستی نظام میں شامل کیا گیا۔ اِس سے چینی سیاسی روایت میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا یعنی ایسی حکمرانی جو طاقت کے ساتھ اخلاق کو بھی اہمیت دیتی ہو۔

کچھ ہی عرصے بعد، تقریباً ۱۳۰ ق م میں، مغرب کی جانب تجارتی راستے کھلنے لگے۔ عمدہ چینی ریشم اسی راستے سے بیرونی دنیا تک پہنچی۔ بعد میں یہ "شاہراہِ ریشم" کہلایا اور چند

ہی صدیوں میں موجودہ پاکستان تک پھیل چکا تھا۔

*

دُور بحیرۂ روم کے کنارے پر قرطاجنہ، جو موجودہ تیونس میں فونیقیوں کی ایک نو آبادی تھا، فتوحات کے شوق میں روم سے ٹکرانے لگا۔

۲۶۴ق م تک روم اپنا پہلا بحری بیڑا تعمیر کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ اُس کے بعد دونوں طاقتوں کے درمیان تین طویل اور خونریز جنگیں چھڑیں، جو کئی کئی برس جاری رہیں۔

اُن میں سے دوسری جنگ کے دوران تقریباً ۲۱۸ق م میں قرطاجنہ کے ایک سپہ سالار ہنی بال نے اسپین میں اپنے اڈے سے ایک حیرت انگیز مہم کا آغاز کیا۔ اُس نے نوے ہزار پیادہ فوج، بارہ ہزار سوار اور ۳۷ ہاتھیوں کے ساتھ ایک دشوار گزار راستہ طے کیا، جو آج کے فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے علاقوں سے گزرتا تھا۔ اگرچہ صرف بیس ہزار پیادہ، چھ ہزار سوار اور چند ہی ہاتھی (اکثر روایات کے مطابق صرف ایک) زندہ بچ سکے، پھر بھی ہنی بال نے اٹلی کے بڑے حصے پر قبضہ جما لیا، اور روم سے صرف ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر مستقل ڈیرے ڈال دیئے۔

ہنی بال روم کے لیے ایک خوفناک سایہ بن گیا لیکن آخر میں رومی حکمتِ عملی غالب آئی۔ ایک طرف انہوں نے ہنی بال کے خلاف گوریلا جنگ کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور دوسری طرف افریقہ میں اُس کی حلیف نومیدیائی سلطنت کو ساتھ ملا لیا۔ ہنی بال کو وطن واپس لوٹنا پڑا اور ۲۰۲ق م میں اُسے رومیوں کے ہاتھوں فیصلہ کن شکست ہوئی۔

۱۴۶ق م میں روم نے قرطاجنہ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ دیواریں گرا دی گئیں، شہر کو آگ لگا دی گئی اور پوری آبادی یا تو قتل کر دی گئی یا غلام بنا لی گئی۔

جس طرح ۴۸۰ ق م میں یونانیوں کی سلامیس کی فتح کے بعد کلاسیکی یونانی ڈرامے کا عروج شروع ہوا، اسی طرح ۲۴۱ ق م میں قرطاجنہ کے خلاف پہلی جنگ میں روم کی فتح (جو ہنی بال کے حملے سے کافی پہلے کی بات ہے)، رومیوں کی زبان لاطینی کے ادب کی ترقی میں سنگِ میل ثابت ہوئی۔ لاطینی ڈراما نگار پلاوطس (Plautus) کے بظاہر مزاحیہ ڈرامے درحقیقت فرد کی شناخت جیسے گہرے موضوعات کو چھیڑتے تھے، مثلاً برادرانِ ماکسمس میں جڑواں بھائیوں کے دو جوڑوں کو پہچاننے میں غلطی کی وجہ سے انتہائی مضحکہ خیز واقعات کا ایک سلسلہ جنم لیتا ہے جسے صدیوں بعد شیکسپیئر نے کامیڈی آف ایررز کا رُوپ دیا اور کسی نہ کسی صورت میں یہ کہانی دنیا بھر کی ثقافتوں میں مقبول ہو چکی ہے۔

لیکن روم جہاں بیرونی طور پر فتوحات کے ایک شاندار دَور میں داخل ہو رہا تھا وہیں اندرونی طور پر عدم استحکام میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ایک طرف اُس نے شمالی افریقہ، اسپین، یونان اور مغربی ایشیا کے کئی حصوں تک اپنا اثر و رسوخ پھیلا لیا اور دُوسری طرف جمہوریہ کے وہ ادارے جو ایک شہری ریاست کے لیے بنائے گئے تھے، اب اِس وسیع سلطنت کے بوجھ سے کمزور ہونے لگے۔ ریاستی عہدوں پر قبضہ کرنے کے لیے جرنیلوں کے درمیان کشمکش ہونے لگی جس میں نجی فوجیں اور سیاسی دھڑے خاص کردار ادا کرنے لگے۔ دوسری طرف زرعی زمین سے محروم شہری آبادی اور جاگیردار اشرافیہ کے درمیان معاشی خلیج بھی گہری ہوتی گئی۔

*

اس دوران فارس میں اشکانیوں (Parthians) کی سلطنت اُبھر رہی تھی۔ اُن کا اقتدار غالباً ۲۵۰ ق م کے لگ بھگ موجودہ تاجکستان کے علاقے سے شروع ہُوا۔ آہستہ آہستہ انہوں

نے ایک ایسی طاقتور سلطنت قائم کی جو ۲۲۴ عیسوی تک فارس اور میسوپوٹیمیا پر چھائی رہی لیکن اس کا حکومتی نظام نسبتاً ڈھیلا اور غیر مرکزی تھا۔

مزید مشرق کی طرف باختر کا علاقہ (جس میں آج کے افغانستان، تاجکستان اور ازبکستان کے کچھ حصے شامل ہیں) اُن یونانی اور مقدونی نسل کے افراد کے قبضے میں تھا جن کے بزرگ سکندرِ اعظم کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اُنہوں نے مقامی آبادی میں شادیاں بھی کیں جس کی ترغیب خود سکندر نے دی تھی۔ تقریباً ۲۰۰ ق م تک اُنہوں نے اپنی سلطنت کو موجودہ افغانستان، پاکستان اور شمالی بھارت کے کئی علاقوں تک پھیلا دیا۔ ان کے ہم عصر انہیں "باختر یا ہندوستان پر حکومت کرنے والے یونانی" کہتے تھے جبکہ مقامی زبانوں میں وہ صرف "یونانی" کہلاتے تھے (آج کل کے مصنفین عام طور پر اُنہیں Indo-Greeks کہتے ہیں)۔

ان یونانیوں کا ایک اہم مرکز ساگلہ تھا، جسے اب سیالکوٹ کہتے ہیں، اور زیادہ امکان اِس بات کا ہے کہ یہی اُن کا دارالحکومت تھا۔ اُس دَور میں موجودہ پاکستان اور افغانستان کے کچھ علاقے دنیا کی معلوم تاریخ میں واحد خطہ بنے جہاں بدھ مت، ہندومت، زرتشتیت اور قدیم یونانی مذہب تقریباً مساوی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ موجود تھے۔ پنجاب اور افغانستان کے دیہات میں ہرکولیس، گوتم بدھ، کرشن اور اہورامزدا ایک ہی روحانی فضا کا حصہ سمجھے جاسکتے تھے، اور یونانی زبان اِن شہروں اور قصبوں میں اُسی طرح بولی جاتی تھی جیسے آج کل انگریزی بولی جاتی ہے۔

یہ میل جول خواہ اب بھلا دیا گیا ہو لیکن تاریخ کے ڈی این اے میں تو بہر حال جذب ہو چکا ہے۔ اس کے دھندلے نقوش اُن حکمرانوں کے سکّوں پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن پر یونانی اور مقامی زبانیں ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہیں، اور یونانی علامات کے ساتھ کرشن

جیسے مقامی دیوتاؤں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔

اِس تہذیبی امتزاج کی سب سے نمایاں مثال اُس بادشاہ کی یاد کی صورت میں محفوظ ہے جس کا نام میناندر اوّل تھا اور جو ۱۶۰ ق م کے لگ بھگ حکومت کر رہا تھا۔ بدھ مت روایات میں ملند کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ نام "بادشاہ ملند کے سوالات" نامی فلسفیانہ مکالماتی کتاب کے ذریعے زندہ ہے جو بادشاہ اور ایک بودھی راہب کی گفتگو پر مبنی ہے۔

ان مکالمات میں میناندر کو ایک ایسا حکمران دکھایا گیا ہے جو ذہانت، اخلاقی سنجیدگی، اور سچائی کی جستجو سے سرشار ہے۔ ایک موقع پر وہ پوچھتا ہے، "اگر میں دنیاوی زندگی کو چھوڑ کر سادھوؤں کی طرح بے گھر ہو جاؤں تو کیا مجھے نجات حاصل ہو سکے گی؟"

نہ حکم، نہ اعلان، بس ایک مخلصانہ سوال! دوسرے بادشاہوں کے برعکس میناندر کی صرف یہی نشانی بچی ہے لیکن یہ نشانی صرف مذہبی نہیں بلکہ تہذیبی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ ایک یونانی اور مقدونی نسل کا بادشاہ کئی ثقافتوں کے سنگم پر حکومت کر رہا ہے لیکن اپنے شاہانہ جاہ و جلال کو ایک طرف رکھ کر عوامی مکالمے میں شریک ہو جاتا ہے۔ سکندر اور اشوک کی میراثیں ایک لمحے کے لیے ملتی ہیں، اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ فتوحات نہیں بلکہ سوالات ہیں۔

آخری ہیرو کا دَور

اس مرحلے کی آخری صدی میں ہمیں دنیا بھر میں ایسے لمحات نظر آتے ہیں جیسے تہذیبوں کے کنارے جاگ اُٹھے ہوں اور سلطنتوں کے مراکز اب بھی خود کو طاقت کا منبع سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔

۷۳ ق م میں رومن جمہوریہ خود لرز اُٹھی جب اسپارٹیکس نامی ایک سابق گلیڈی ایٹر

نے غلاموں کی ایک بڑی بغاوت کی قیادت کی۔ گلیڈی ایٹر وہ غلام تھے جنہیں تربیت دے کر رومن اکھاڑوں میں تماش بینوں کی تفریح کے لیے لڑوایا جاتا تھا جہاں وہ حاضرین کی مرضی کے مطابق بڑی بیدردی کے ساتھ ایک دُوسرے کو قتل کرتے تھے اور خود بھی قتل ہو جاتے تھے۔ اگرچہ اسپارٹیکس کی جلد ہی کچل دی گئی لیکن اُس کی بازگشت ہمارے زمانے میں بھی سیاسی تحریروں سے لے کر مقبول ترین فلموں میں سنی جاسکتی ہے۔

اس واقعے کے تقریباً ایک دہائی بعد ۶۳ ق م میں جب رومیوں نے بالآخر یروشلم کو اپنی سلطنت کا حصہ بنایا تو اُن کے مشہور ترین جرنیل پومپی اعظم نے کسی جھجھک کے بغیر ہیکلِ سلیمانی کے اُس حصے میں قدم رکھ دیا جسے مقدس ترین مقام (Holy of Holies) کہا جاتا تھا اور جہاں یہودیوں کے اعلیٰ کاہن بھی سال میں صرف ایک بار، اور وہ بھی مکمل تطہیر کے بعد داخل ہو سکتے تھے۔ یہ منظر کہ ایک غیر قوم کا جرنیل ایسی جگہ میں بے خوف داخل ہو گیا اور سلامت بھی رہا، یہودی ذہن پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ اُس مسیحا کا انتظار مزید شدت اختیار کر گیا جو محض روحانی رہنما نہ ہو بلکہ قومی وقار کو بحال کر دے۔

تقریباً ۵۰ ق م کے لگ بھگ چین کی سرحدوں سے بے دخل ہونے والے کچھ خانہ بدوش قبائل باختر میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ یہ یوئے ژی (Yuezhi) کہلاتے تھے اور آنے والی صدی میں وہ عظیم کُشان سلطنت قائم کرنے والے تھے۔

دنیا کے دوسری طرف جنوبی امریکہ میں ناز کا تہذیب ۱۰ ق م کے آس پاس اپنے فن اور رسومات کے نقطۂ عروج پر پہنچی۔ اگرچہ اینڈیز کے پہاڑی علاقوں کی دیگر تہذیبوں کے مقابلے میں ناز کا لوگ نسبتاً سادہ زندگی گزارتے تھے مگر اُن کے بنائے گئے جیو گلفس یعنی صحرائی میدانوں پر اُبھرے دیو قامت نقش و نگار ایسی تخلیقی صلاحیت اور انجینیئرنگ مہارت کا مظہر ہیں جو آج بھی ماہرین کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

اگر ان تمام واقعات کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو ایک ایسی دنیا کا منظر سامنے آتا ہے جو اپنی سطح کے نیچے کہیں ہل رہی تھی۔ سلطنتیں اب بھی پھیل رہی تھیں اور فتوحات کا سلسلہ جاری تھا لیکن تہذیب کے اصل معنی اب مرکز کے بجائے کناروں کی طرف منتقل ہونے لگے تھے۔ یہ بات یقینی نہ رہی تھی کہ مستقبل صرف مرکز سے وابستہ ہے۔ تاریخ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا رُخ بدلنے کی تیاری کر رہی تھی۔

۹۱ ق م میں رومن جمہوریہ اندر سے ٹوٹنے لگی جب روم اور اُس کی اطالوی اتحادی ریاستوں کے درمیان ایک سماجی جنگ چھڑ گئی۔ یہ وہ ریاستیں تھیں جو طویل عرصے سے روم کے لیے جنگیں لڑتی آئی تھیں مگر اُنہیں مکمل شہریت کے حقوق حاصل نہ تھے۔ اتحادی ریاستیں جنگ ہار گئیں مگر شہریت حاصل کر لی۔ روم جنگ جیت گیا لیکن اُس کا جمہوری نظام بکھرنے لگا اور کچھ ہی عرصے میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔

۸۳ ق م میں اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک فوجی جرنیل سُلّا نے اپنی فوجوں کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر کے سینیٹ سے اپنے آپ کو ''ڈکٹیٹر'' منوا لیا۔ یہ اصطلاح پہلے سے موجود تھی اور ایک خاص منصب کے لیے استعمال ہوتی تھی جو ہنگامی حالات میں ایک مختصر مدّت کے لیے دیا جاتا تھا۔ مگر سُلّا کے اقدام نے یہ تباہ کن مثال قائم کر دی کہ کوئی بھی طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کر کے بعد میں اُسے قانونی رنگ دِلوا سکتا تھا۔

۶۰ ق م میں روم کے اعلیٰ عہدوں پر قبضے کے لیے تین طاقتور شخصیات نے خفیہ اتحاد کر لیا۔ یہ تین اشخاص تھے، پومپی اعظم جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے؛ روم کا امیر ترین اور بدنام تاجر کراسس؛ اور ایک باوقار خاندان سے تعلق رکھنے والا گائیئس جولیس سیزر، جو عوامی طبقے سے ہم آہنگی کا دعویٰ کرتا تھا اور اصلاحات کے نعرے سے اپنے ہی طبقے کے اثر و رسوخ کو چیلنج کرتا تھا۔ سیزر نے اِس اتحاد کو اپنے سیاسی اور عسکری کیریئر کو آگے

بڑھانے کے لیے استعمال کیا اور اپنی شخصیت کا سحر قائم کر دیا۔

۴۹ق م میں سیزر نے روم کی سینیٹ کے خلاف بغاوت کر دی۔ ایک اور خانہ جنگی چھڑی، جس میں سیزر اور پومپی ایک دوسرے کے مقابلے پر آ گئے۔ پومپی اگلے برس مارا گیا لیکن روم کے شہری مزید کئی برس تک سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے۔ اِس دوران میں سیزر عملی طور پر اقتدار کا مرکز بن چکا تھا اور مختلف ریاستی عہدے اپنے ہاتھ میں سمیٹنے لگا تھا جن میں سب سے نمایاں قونصل اور ڈکٹیٹر کے عہدے تھے۔

۴۸ ق م میں، مصر کی فوجی مہم کے دوران سیزر کی ملاقات قلوپطرہ ہفتم سے ہوئی جو سکندر اعظم کے جرنیل بطلیموس کی نسل سے تھی اور کچھ عرصے پہلے مصر کے تخت سے معزول کر دی گئی تھی۔ قلوپطرہ کی اُمنگوں اور سیزر کی سیاسی قوّت میں ایک عجیب ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ سیزر نے اسے تخت پر بحال کر دیا اور دونوں سے ایک لڑکے نے بھی جنم لیا۔ ۴۵ق م میں سیزر روم واپس آیا تو قلوپطرہ ایک باجگزار ریاست کی حکمراں کے طور پر اُس کے ساتھ تھی۔

سیزر نے بڑی اصلاحات نافذ کیں۔ ان میں جولین کلینڈر شامل تھا، جس نے سال کو ۳۶۵ دنوں پر منظم کیا اور ہر چوتھے سال ایک دن کا اضافہ (لیپ ڈے) رکھا۔ یہی کلینڈر بعد میں اُس عیسوی کیلنڈر کی بنیاد بنا جو اَب عام طور پر دنیا میں رائج ہے۔

سیزر کو "تاحیات ڈکٹیٹر" مقرر کیا گیا اور اِس بات کا واضح خطرہ دکھائی دینے لگا کہ جلد ہی وہ بادشاہ بن بیٹھے گا اور روم میں بادشاہت واپس آ جائے گی۔ سیزر کا اقتدار ایک طرح سے پانچویں مرحلے کا ایک چھوٹا نقطۂ عروج بھی تھا کیونکہ سیزر نے روم کو ایک ایسی وحدت دی تھی جو رضامندی سے نہیں بلکہ زبردستی مسلط کی گئی تھی۔

۴۴ق م میں جولیس سیزر کو ساٹھ سے زیادہ سینیٹروں کے ایک گروہ نے خنجروں کے وار کرکے قتل کر دیا۔ ان کا رہنما مارکس بروٹس اُس نیم افسانوی شخصیت کی نسل سے تھا جس نے مبینہ طور پر پانچ صدیاں قبل ۵۰۹ ق م میں خودکشی کرنے والی معزز خاتون کے جسم سے خنجر نکال کر عہد کیا تھا کہ آیندہ کوئی بادشاہ روم پر حکومت نہ کرے گا۔ بروٹس صرف اِسی جذبے کے تحت اور پورے خلوص کے ساتھ جمہوریت کو بچانے کے لیے سیزر کے قتل کے منصوبے میں شریک ہُوا تھا۔

مگر جمہوری روایات بحال نہ ہو سکیں۔ سیزر کے وفاداروں نے جلد ہی اقتدار پر قبضہ جما لیا اور سینیٹ نے سیزر کو اُس کی موت کے بعد ایک دیوتا تسلیم کر لیا۔ وہ پہلا رومی تھا جسے رسمی طور پر یہ اعزاز دیا گیا اور اِس طرح یہ رواج چل نکلا کہ روم کے اکثر حکمرانوں کو اُن کی موت کے بعد سینیٹ دیوتا قرار دے دیتی تھی۔ خود "سیزر" بعد میں آنے والے رومی حکمرانوں کا لقب بن گیا۔ یونانی میں اِسے کیسر کہتے تھے جو عربی میں قیصر بنا جبکہ اصل یونانی لفظ جرمنی کے بعض بادشاہوں کا لقب بھی بنا۔ رُوسی زبان میں یہ لفظ "زار" بن گیا جو رُوس کے شہنشاہوں کا لقب رہا۔

بروٹس اور دیگر جمہوریت پسندوں نے روم سے فرار ہو کر مقابلے کے لیے فوج تیار کی لیکن ۴۲ ق م میں شکست کھا گئے۔ شکست کے بعد بروٹس نے خودکشی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے مرنے سے پہلے سرگوشی کی، "اے نیکی! تُو تو محض ایک نام تھی!"

بروٹس کی موت نے اُس کے مخالفین کو بھی متاثر کیا اور سب نے اِسے ایک قربانی اور اِس بات کا اعلان سمجھا کہ جس زندگی میں آزادی نہ ہو وہ جینے کے قابل نہیں ہے۔ یہ لمحہ گویا پانچویں مرحلے کا اخلاقی نقطۂ عروج تھا۔ یہ اصول کہ حکومت کی بنیاد کسی اخلاقی جواز پر ہونی چاہیے، پہلے صرف سائرس، سکندر اور اشوک جیسے بادشاہوں کے رُوپ میں نظر آیا

تھا لیکن اب اِس نے ایک جمہوری سیاسی شخصیت کی شکل اختیار کی تھی۔ بروٹس کی زندگی ایسے سوالات کو جنم دے گئی جو آج بھی زندہ ہیں، مثلاً یہ سوال کہ اگر جمہوریت کے ظاہری ڈھانچے باقی رہیں لیکن اندر سے وہ شخصی خواہشات کے ہاتھوں کھوکھلے ہو جائیں تو کیا باقی رہ جاتا ہے؟

آنے والی نسلوں نے بروٹس کا نام یاد رکھا اور دنیا کے عظیم ترین ڈرامہ نگار شیکسپیئر نے اُسے اِن الفاظ کے ذریعے ایک نئی حیثیت عطا کر دی کہ "اُس کی زندگی شریفانہ تھی اور اُس میں عناصر اِس طرح یکجا ہوئے تھے کہ فطرت خود اٹھ کھڑی ہو اور ساری دنیا سے کہہ دے: یہ تھا انسان!":

His life was noble, and the elements
So mixed in him, that Nature might stand up
And say to all the world, 'This was a man!'

سیزر کے قتل کے بعد، تین بااثر شخصیات کو سینیٹ نے غیر معمولی اختیارات دے دیئے جو تمام اداروں سے بالاتر تھے۔ یہ تین افراد سیزر کا وفادار دوست مارک انطنی، سیزر کا منہ بولا بیٹا اور وارث اوکتاوِیَن، اور ایک اور شخص لیپیڈس تھا۔ ان تینوں نے روم کی سلطنت آپس میں بانٹ لی۔

انطنی کو مشرقی صوبے ملے جن میں مصر بھی شامل تھا۔ اِس لیے ۴۱ ق م میں قلوپطرہ نے طرسوس (موجودہ ترکی) میں اُس کے ساتھ ملاقات کی اور اپنے آپ کو ایک مصری دیوی کے روپ میں پیش کیا۔ اُن دونوں کے سیاسی اور رومانوی اتحاد نے روم کو ہلا دیا، اوکتاوِیَن کے ساتھ انطنی کے تعلقات کشیدہ کر دیئے اور بالآخر خانہ جنگی کا سبب بنے۔

۳۰ ق م میں انطنی اور قلوپطرہ شکست کھا کر مصر میں محصور ہو گئے۔ انطنی نے خودکشی کر لی اور قلوپطرہ بھی مردہ پائی گئی۔ بظاہر اُس نے بھی خودکشی کی تھی، شاید اِس بے عزتی

سے بچنے کے لیے کہ اُسے روم میں قیدی بنا کر پیش کیا جانا تھا۔ اِس طرح سکندرِ اعظم کے سلسلے سے تعلق والی آخری یونانی حکمراں اور مصر کی آخری فرعون رومی سلطنت کی داستان میں جذب ہو جانے کے بجائے تاریخ میں اپنے لیے ایک علیحدہ مقام بنا گئی۔

۲۷ ق م میں، اوکتاوین نے بظاہر سینیٹ کو اقتدار لوٹا کر کئی بڑے عہدے لے لیے، جیسے پہلا شہری، سپہ سالار اور سب سے بڑا پروہت۔ چونکہ تمام طاقت ایک ہی شخص میں مجتمع ہو گئی اس لیے جدید مؤرخین اسے جمہوریہ کے خاتمے اور سلطنت کے آغاز سے تعبیر کرتے ہیں۔

یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اوکتاوین اور اس کے جانشینوں کو اُن کے اپنے دور میں کبھی بادشاہ یا شہنشاہ نہیں کہا گیا۔ سینیٹ نے اوکتاوین کو جو لقب عطا کیا اور جسے بعد کے حکمرانوں نے بھی اختیار کیا، وہ "آگُسٹس" (یعنی قابلِ تعظیم) تھا لیکن رومی جمہوریہ کو کبھی باضابطہ طور پر ختم نہیں کیا گیا۔ سینیٹ، قونصل اور عوامی مجالس جیسے جمہوری ادارے ۴۷۶ عیسوی یعنی سلطنتِ روم کے اختتام تک قائم رہے اور ہر رومی "بادشاہ" رسمی طور پر ضرور دعویٰ کرتا رہا کہ وہ منتخب ہوا ہے۔ اِس سے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک ترقی یافتہ تہذیب بھی اِس وہم میں رہ سکتی ہے کہ وہ ابھی تک ایک جمہوریت ہے جبکہ حقیقت میں اُس کا نظام مکمل طور پر شخصی حکومت میں ڈھل چکا ہو۔ قدیم زمانے میں یہ روم کے ساتھ ہُوا اور موجودہ زمانے میں کئی تہذیبوں کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا ہے۔

آگسٹس کے تحت روم نے اپنی سرحدیں پھیلائیں، صوبے منظم کیے اور مالیات و انتظام میں اصلاحات نافذ کیں۔ اُس نے شاہی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے شاندار تعمیرات کروائیں اور خود کو نظم و ضبط کی مجسم علامت کے طور پر پیش کیا۔ اُس کا ایک

محبوب قول تھا، ”آہستہ آہستہ جلدی کرو۔“[1]

لاطینی ادب کا سنہری دور (۸۱ ق م تا ۱۷ عیسوی)، جو آگسٹس سے کچھ پہلے شروع ہُوا تھا، اُس کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ مؤرخ لیوی نے روم کی تاریخ کو مرتب کیا۔ شاعر اووِڈ کی طویل نظم میٹا مارفوسس نے ایسی کہانیاں دیں جو آج بھی زندہ ہیں، مثلاً نوجوان پیریمس اور تھِسبِی کی ناکام محبت جسے صدیوں تک مختلف انداز میں دہرایا جاتا رہا اور بالآخر شیکسپیئر نے اِسے رومیو اور جولیٹ کے طور پر پیش کیا۔

مگر وہ شاہکار جو رومی تہذیب کے لیے ایک نئی بنیاد بن گیا، ورجل کی اینیڈ ہے۔ یہ رزمیہ ٹرائے کے شہزادے اینیاس کے سفر کو بیان کرتا ہے، جس کی طرف پچھلے باب میں بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ ٹرائے کی بربادی کے بعد وہ جان بچا کر نکلتا ہے اور اٹلی پہنچتا ہے جہاں اُس کی نسل سے روم کی بنیاد رکھی جائے گی۔ بظاہر شاعر نے اِس ہیرو کے ذریعے آگسٹس کی ایک علامتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، سنجیدہ، فرض شناس اور دیوتاؤں کی طرف سے منتخب کیا ہوا لیکن اندر سے خالی! اس کے باوجود آخری منظر میں اینیاس کی حرکتیں بروٹس سے زیادہ مشابہ نظر آتی ہیں جب وہ ایک شکست خوردہ دشمن پر تلوار تانے کھڑا ہے، لمحہ بھر ٹھہرتا ہے اور پھر جان لیوا وار کرتا ہے۔ کیا روم کی روح نے اپنے سب سے بڑے شاعر کے تخلیقی وجدان میں بروٹس کی جھلک شامل کر دی تھی؟

*

دُور برصغیر میں ایک اور طرح کا ہیرو تخیل میں اُبھر رہا تھا۔

بھگوت گیتا، جس کی تحریر ایک اندازے کے مطابق ۸۵ ق م کے آس پاس مکمل

---

[1] ‘Festina lente’

ہوئی، مہابھارت کی جنگ کے دوران ارجن اور کرشن کا مکالمہ ہے۔ ارجن جنگ کی خونریزی دیکھ کر گھبرا رہا ہے اور کرشن اُسے جذبات سے نہیں بلکہ فراست سے جواب دیتے ہیں کہ نتائج سے بے پرواہو کر صرف درست عمل کرو: "تمہیں صرف عمل کا حق ہے، اس کے نتائج کا نہیں۔" اقبال نے بعد میں یہ رائے ظاہر کی کہ گیتا برصغیر کے لیے بیداری کا پیغام اور خیالی فلسفوں سے عمل کی طرف واپس آنے کی دعوت تھی۔[1]

اگر بھگوت گیتا نے پانچویں مرحلے کا پیغام واضح کیا، اُس مرحلے کا پیغام جس کے دوران میں سلطنتیں بنیں، فلسفے لکھے گئے اور سوالات اٹھائے گئے، تو زندگی اگلے مرحلے میں داخل ہونے کے لیے نہ کسی سپہ سالار کی طرف گئی اور نہ کسی فلسفی کی طرف۔ زندگی نے یروشلم کی نیک اور سادہ دل عورتوں کی طرف رُخ کیا۔ یروشلم، جو اَب روم کی زیرِ نگیں ایک چھوٹی سی ریاست بن چکا تھا، جیسا کہ پہلے بیان ہُوا۔

روایت ہے کہ ایک پرہیز گار یہودی عورت حنّہ نے منت مانی کہ اگر اُسے اولاد ہوئی تو وہ اُسے خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دے گی۔ ۲۰ سے ۱۶ ق م کے لگ بھگ اولاد ہوئی لیکن وہ ایک لڑکی نکلی، اور ممکنہ طور پر پہلی دفعہ کسی لڑکی کو ہیکل کی خدمت کے لیے مخصوص کیا گیا۔ حنّہ نے دُعا مانگی، "اے پروردگار! میں نے لڑکی کو جنم دیا ہے، اور لڑکی لڑکے جیسی نہیں ہوتی۔ میں نے اُس کا نام مریم رکھا ہے، اور اُسے اور اُس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" مگر خدا بہتر جانتا تھا کہ اُس نے کیا عطا کیا ہے۔

بی بی مریم علیہا السلام کی پرورش حضرت زکریا علیہ السلام کے زیرِ سایہ ہوئی۔ جب بی بی مریمؑ جوان ہوئیں تو فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اُن کے پاس آئے اور کہا، "میں تمہارے رب کی طرف سے ایک پیغام رساں ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا عطا

1

کروں۔" بی بی مریمؑ نے حیرانی سے پوچھا، "میرے ہاں کیسے بیٹا ہو گا؟ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، اور میں بدکار بھی نہیں!" جبرئیلؑ نے جواب دیا، "ایسا ہی ہو گا۔ تمہارے رب نے فرمایا ہے: 'یہ میرے لیے آسان ہے۔ اور میں اُسے انسانیت کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے ایک رحمت بناؤں گا۔ یہ بات طے ہو چکی ہے۔'" اِس طرح انسانیت پانچویں سے چھٹے مرحلے میں داخل ہوئی۔

باب ٦

روحانی تجربے

۴ قبل مسیح سے ۵۷۰ عیسوی

جاوید نامہ کے پہلے باب میں تاریخ کے چھٹے دَور کی علامت طاسینِ مسیحؑ ہے۔ یہ تیسرا طاسین ہے جسے مولانا روم اور اقبال چاند پر دیکھتے ہیں۔

طاسینِ مسیحؑ پر رُوسی مصنف اور مفکر لیو ٹالسٹائی (۱۸۲۸–۱۹۱۰ء) کا ایک خواب پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ اُس خواب میں اِس بات پر زور ہے کہ جدید تہذیب نے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی روح سے غداری کی ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے اصل پیغام کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں، مثلاً مریمؑ کے بیٹے کا وجود کائنات کے لیے چراغ ہے اور اُن کا نور ہر سمت میں، یہاں تک کہ دکھائی نہ دینے والی سمتوں میں بھی پھیلا ہے:

پورِ مریم آں چراغِ کائنات
نورِ او اندر جہات و بے جہات[1]

اقبال نے ایک اور مقام پر لکھا ہے، ''مسیحیت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُس نے روحانی زندگی کے لیے ایک ایسا مواد تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جو انسان کی روح سے باہر کی

---

[1] اقبال، جاوید نامہ، ص ۵۶

دنیا کی قوّتوں کے ذریعے نہیں بلکہ خود اُس کی روح میں ایک نئی دنیا کے انکشاف سے برآمد ہو سکتا ہے۔"[1]

لٰہذا پچھلے مرحلے میں جو حقیقت سائرس اور کلیس تھنیز جیسے افراد میں بیدار ہوئی، جس کے نتیجے میں سیاسی نظام وجود میں آئے، وہ اِس دَور میں بالکل مختلف نوعیت کے انسانوں میں بیدار ہونے والی تھی، جس کے نتیجے میں روحانی نظام قائم کرنے کی کوششیں ہونے والی تھی۔

اِنسانی تاریخ کے رُخ میں یہ تبدیلی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ مذہبی روایات کے مطابق وہ یروشلم کے نزدیک بیت اللحم کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بعد میں اُن کی ولادت کے سال سے عیسوی کیلنڈر کا آغاز کیا گیا یعنی اُن کی ولادت ۱ء میں فرض کی گئی۔ لیکن پھر معلوم ہُوا کہ یہ اندازہ درست نہیں تھا اور وہ ممکنہ اس سے چار سال پہلے پیدا ہوئے تھے، چنانچہ اب اُن کی ولادت ۴ق م میں تسلیم کی جاتی ہے۔

تقریباً تیس برس کی عمر میں اُنہوں نے "بادشاہتِ خداوندی" کی دعوت دینا شروع کی۔ یہ کوئی زمینی ریاست یا سیاسی نظام نہیں بلکہ ایک روحانی حقیقت تھی۔ اگرچہ وہ بادشاہت ابھی آنی تھی لیکن ان لوگوں کے لیے گویا آچکی تھی جو ایمان اور محبت کے مطابق عمل کرتے ہیں اور دُوسروں پر برتری کا دعویٰ نہیں کرتے۔

بائبل بتاتی ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک عورت کو بدکاری کے جرم میں پکڑ کر حضرت عیسیٰؑ کے پاس لائے اور پوچھا کہ کیا اُسے شریعت کے مطابق سنگسار کیا جائے؟ اُنہوں نے جواب دیا، "پہلا پتھر تم میں سے وہ پھینکے جس نے خود کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو!" ایک ایک کر کے سب الزام لگانے والے پیچھے ہٹ گئے۔ تب حضرت عیسیٰؑ نے اُس

---

[1] Iqbal, *Reconstruction,* p.8

عورت سے کہا، ”میں بھی تمہیں مجرم نہیں ٹھہراتا۔ جاؤ، اور اب گناہ مت کرنا۔“

سب سے پہلے غریبوں اور نچلے طبقے کے لوگوں نے اِس دعوت کو قبول کیا اور پھر آہستہ آہستہ بہت سے لوگ اِس بات پر ایمان لائے کہ حضرت عیسیٰؑ وہی مسیح (Christ) ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق اُن کی باتیں سننے آنے لگے:

> اور لوگوں نے پوچھا، ”پھر ہم کیا کریں؟“ [حضرت عیسیٰؑ نے] کہا، ”جس کے پاس دو کُرتے ہوں، وہ ایک اُس کو دے دے جس کے پاس کوئی نہیں؛ اور جس کے پاس کھانا ہو، وہ بھی یہی کرے۔“[1]

اُن سے معجزے بھی منسوب کیے گئے، جن کی بعد میں قرآن نے بھی تصدیق کی:

> اے عیسیٰ بن مریم! یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر کیا، جب میں نے تمہیں روحُ القدس سے تقویت دی، تم نے لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کی اور بڑی عمر میں بھی؛ اور جب میں نے تمہیں کتاب، حکمت، تورات اور انجیل سکھائی؛ اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بناتے، پھر اُس میں پھونک مارتے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا؛ اور تم میرے حکم سے مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دیتے؛ اور تم مُردوں کو میرے حکم سے زندہ کر کے نکالتے۔ (مائدہ:۱۱۰)۔

صرف تین سال کی تبلیغ کے بعد حضرت عیسیٰؑ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اِس کے متعلق مختلف بیانات ہیں کہ یہ کیسے ہُوا۔ اُن کے ماننے والوں یعنی مسیحیوں کے مطابق یہودی اشرافیہ کو اُن کی تعلیمات سے خطرہ محسوس ہوا اور اُن کے مطالبے پر رُومی حکام نے ۳۰ء کے قریب حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دے دی لیکن وہ تین دن بعد قبر

---

[1] Luke 3:11

سے اُٹھے، چالیس دن تک اپنے شاگردوں کے درمیان رہے اور پھر اُن کے سامنے آسمان کی طرف اُٹھا لیے گئے۔

دُوسری طرف قرآن کا کہنا ہے، "نہ اُنھوں نے اُسے قتل کیا، نہ صلیب دی، بلکہ اُنہیں شبہ میں ڈال دیا گیا۔ اور جو لوگ اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ بھی شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس اس کی کوئی یقینی خبر نہیں، محض گمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور یقیناً، اُنھوں نے اُسے قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اُسے اپنی طرف اُٹھا لیا، اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا۔" (النسآ:۱۵۷-۱۵۸)۔

*

اُدھر روم میں آگسٹس ۱۴ء میں وفات پا چکا تھا۔

اُس کے بعد آنے والے بعض حکمراں سلطنت کو سنبھالنے میں کامیاب ہوئے اور بعض خود ہی عدم توازن اور دیوانگی کی علامت بن گئے، جیسے کلیگولا (حکومت: ۳۷ سے ۴۱ء) اور نیرو (۵۴ء سے ۶۸ء)، جو آج زیادہ تر اپنی سفاکی اور جنون کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔

بیرونی طور پر ۹ء میں رومیوں کو جرمنی کے قبائل کے ہاتھوں زبردست شکست ہوئی۔ لیکن برطانیہ میں اُن کی پیش قدمی جاری رہی۔ وہاں کیلٹ قوم کی ملکہ بوڈیکا (Boudica) نے ۶۰ء کے قریب بغاوت کی جب رومیوں نے اُس کے شوہر کے مرنے کے بعد زمینوں پر قبضہ کر لیا، اُسے کوڑے مارے اور اُس کی بیٹیوں پر دست درازی کی۔ اگرچہ یہ بغاوت آخر میں کچل دی گئی لیکن بعد میں بوڈیکا برطانوی تاریخ میں قومی غیرت، بہادری اور نسوانی قیادت کی علامت بن گئی اور آج اُس کا مجسمہ لندن میں پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب

نصب ہے۔

اُن ہنگاموں سے دُور موجودہ پاکستان اور افغانستان کے بعض علاقوں میں ایک اور قسم کی کشمکش جاری تھی۔ یہاں حکومت کرنے والے باختری یونانیوں کو، جن کا ذکر پچھلے باب میں ہُوا ہے، ۱۰ء کے قریب اشکانیوں (Parthians) کی ایک شاخ نے بے دخل کر کے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن باختری یونانیوں کی تہذیبی میراث اپنی الگ زندگی اختیار کر چکی تھی۔ خاص طور پر گندھارا کے خطے (یعنی موجودہ خیبر پختونخواہ، مشرقی پاکستان اور آس پاس کے بعض علاقے) میں یونانی فنونِ لطیفہ اور بدھ مت کی روایات کے درمیان ایک زرخیز آمیزش جنم لے رہی تھی جسے بعد میں گندھارا کی تہذیب کہا گیا۔ خانقاہیں اور سٹوپے، جن کے کھنڈر آج بھی وادیوں اور پہاڑوں میں بکھرے ہوئے ہیں، اُس زمانے میں ترقی کر رہے تھے اور دور دراز سے زائرین یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ پتھر پر اُبھری ہوئی تصویروں اور مجسموں میں گوتم بدھ کی جیتی جاگتی شبیہیں تراشنے کا فن پختگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

*

یہودیوں کے علاقے یہودیہ میں (جہاں یروشلم بھی واقع تھا)، حضرت عیسیٰؑ کے پیغام سے شروع ہونے والی تحریک پھیلتی جا رہی تھی۔

حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار اپنی تحریک کو "راہِ حق" (The Way) کہتے تھے۔ وہ خود کو کسی نئے مذہب کے بانی نہیں بلکہ یہودیت ہی کی اصلاح کرنے والے سمجھتے تھے اور یہودی شریعت پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اب غیر یہودی اقوام کے لوگ بھی ایمان لانے لگے تھے۔ ۴۹ء تک مسیحی (Christian) کی اصطلاح وجود میں آ چکی تھی۔

۴۹ء ہی میں اس تحریک کے رہنماؤں نے یروشلم میں ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی تاکہ اِس سوال پر غور کیا جاسکے کہ کیا غیر یہودی ایمان لانے والوں پر بھی یہودی شریعت کی پابندی لازم ہے؟ اہم رہنما، جن میں سینٹ پال (اندازۃً ۵ ق م سے ۶۵ء) بھی شامل تھے، اِس بات پر متفق ہوئے کہ غیر یہودی اقوام کے افراد تورات کی پابندی کیے بغیر بھی مسیحیت کے عقیدے کو قبول کرسکتے ہیں۔ چند بنیادی ممانعتیں تجویز کی گئیں، مثلاً بت پرستی اور جنسی بے راہروی سے گریز، مگر حضرت عیسیٰؑ کو مسیحا تسلیم کرنا ایمان کی اصل بنیاد قرار پایا۔

اُس وقت تک مسیحیت یا عیسائیت روم تک پہنچ چکی تھی اور شک کی نظر سے دیکھی جا رہی تھی۔ ۶۴ء میں روم میں ایک خوفناک آگ بھڑک اٹھی جس نے ہزاروں شہریوں کو بے گھر کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے اِس آگ کا الزام ناپسندیدہ شہنشاہ نِیرو پر لگایا اور نِیرو نے الزام کو مسیحیوں کی طرف منتقل کر کے اُن پر ظلم و ستم کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ کچھ کے سر قلم کیے گئے لیکن اکثر کو کہیں زیادہ دردناک طریقوں سے قتل کیا گیا۔ صلیب پر چڑھایا گیا، شاہی باغات کو روشن کرنے کے لیے اِنسانی مشعلوں کے طور پر زندہ جلایا گیا، اکھاڑوں میں شیروں، چیتوں اور دوسرے وحشی جانوروں کے آگے ڈالا گیا۔ اِن ابتدائی شہیدوں کے آخری الفاظ محفوظ نہیں مگر شاید وہ اُن الفاظ سے مختلف نہ ہوں جو تقریباً سو برس بعد زندہ جلائے جانے والے ایک عیسائی نے اپنے رومی جلادوں سے کہے: ”تم مجھے اُس آگ سے ڈراتے ہو جو ایک وقت کے لیے جلتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے، لیکن تم اُس دائمی آگ سے ناآشنا ہو جو بدکاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

یوں شہادت چھٹے مرحلے کی ایک علامت بن گئی، ایک خاموش مزاحمت جس نے تاریخ کی تاریک ترین خاموشی میں بھی روشنی کو بجھنے نہ دیا!

دُوسری طرف یہودیہ کے علاقے میں رومی اقتدار کے خلاف مدّت سے دبے ہوئے جذبات پھٹ پڑے اور ۶۶ء میں کھلی بغاوت کی صورت اختیار کر گئے۔ باغیوں نے شہر پر قبضہ کر کے آزادی کا اعلان کر دیا۔

۷۰ء میں روم نے شہر کو دوبارہ فتح کر کے سخت انتقام لیا۔ ہیکل کی ایک ایک اینٹ گرا دی گئی۔ ہزاروں یہودی قتل کر دیے گئے، اور بے شمار بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ یہودیت کا مقدس ترین مرکز صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

*

جس دنیا میں حضرت عیسیٰؑ کا ظہور ہُوا تھا، اُس دنیا کے خاتمے کا آغاز ہو چکا تھا۔

اُن کے ماننے والوں نے اُن کی زندگی اور تعلیمات کو محفوظ کرنے کا کام شروع کیا۔ چنانچہ قریباً تیس برس کے اندر اندر یعنی ۱۰۰ء کے قریب وہ چاروں صحیفے مکمل ہو چکے تھے جنہیں مسیحی اب انجیلِ مقدس تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی وہ دُوسری تحریریں بھی مکمل ہو گئیں جو بائبل کے مسیحی حصے عہد نامۂ جدید (The New Testament) میں انجیل کے ساتھ شامل ہیں۔

ان تحریروں کے ساتھ ایک نیا دینی نظریہ بھی آیا اور وہ یہ کہ بیت المقدس کی تباہی محض ایک المیہ نہیں بلکہ ان واقعات میں سے ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی واپسی سے پہلے ضروری تھے۔ کیونکہ ابتدائی عیسائی رہنما، جیسے سینٹ پال، کہہ چکے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی واپسی سے پہلے ایک بڑی بغاوت، شدید مصائب اور ایک جھوٹا مسیح (دجال) نمودار ہو گا۔ اب یہ مانا جانے لگا کہ خدا نے اپنے پیغام کی ذمہ داری یہودیوں سے لے کر مسیحیوں کو دے دی ہے۔

خود یہودیوں کے لیے ہیکلِ سلیمانی کی تباہی ایک گہرا رُوحانی اور نفسیاتی زخم تھی۔ کچھ نے خود احتسابی کی طرف توجہ دی اور کچھ اتنے مشتعل ہوئے کہ ۱۳۲ء میں ایک اور بغاوت کھڑی کر دی۔ اِس دفعہ قیادت ایک شخص کے ہاتھ میں تھی جسے یہودی مسیحا قرار دے رہے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے اُنہوں نے ایک آزاد ریاست قائم کر لی اور سکے جاری کیے۔ ۱۳۶ء میں رومی افواج نے اس بغاوت کو بھی بے رحمی کے ساتھ کچل ڈالا۔ اِس بار اُنہوں نے صرف بغاوت ختم کرنے پر اِکتفا نہیں کی بلکہ یروشلم سے یہودیوں کے ہر نشان کو مِٹا دیا۔ شہر کا نام بھی بدل دیا اور وہاں یہودیوں کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔

اِس طرح وہ دنیا جو حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں موجود تھی، مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ اب ایک نئی دنیا کو جنم لینا تھا:

خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں
جچتے نہیں بخشے ہُوئے فردَوس نظر میں
جنّت تِری پنہاں ہے تِرے خُونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ![1]

باطنی بادشاہی

اُس زمانے تک روم ایک نسبتاً مستحکم اور خوشحال دور میں داخل ہو چکا تھا، جسے بعد کے مؤرخین "پانچ اچھے شہنشاہوں کا دور" (۹۶ تا ۱۸۰ء) کہتے ہیں۔

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۷۹

لیکن چھٹے مرحلے کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض بادشاہ جو سوچ میں روشن خیال تھے، مذہبی معاملات میں حد سے زیادہ متعصب ثابت ہوئے۔ اس کی ایک مثال مارکس اوریلیئس ہے، جو نہ صرف روم کے "پانچ اچھے شہنشاہوں" میں سے تھا بلکہ اُس کی تصنیف تأملات، روشن خیالی کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے، جہاں وہ ایک فلسفی بن کر فرض، انکساری، اور زندگی کی ناپائیداری پر غور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دُوسری طرف یہی شہنشاہ مسیحیوں کے خلاف شدید ترین مظالم کروانے والوں میں سے تھا۔

دُور مشرق میں کُشان سلطنت وسطی ایشیا سے اُبھری تھی اور افغانستان سے ہوتی ہوئی برِصغیر کے شمال مغربی علاقوں تک پھیل گئی جن میں موجودہ پاکستان کا بیشتر رقبہ شامل تھا۔ اُس سلطنت کے عظیم ترین فرمانروا، کنشک اعظم (دورِ حکومت: قریب ۱۲۷ تا ۱۵۰ ء) نے پشاور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اِسے تجارت، سیاست اور مذہبی زندگی کا زرخیز مرکز بنا دیا۔ اُس دَور کے گندھارا کی ایک عظیم یادگار گوتم بدھ کا وہ مجسمہ ہے جو اَب لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے لیکن دنیا بھر میں "فاقہ کش گوتم" (The Fasting Buddha) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

اُس زمانے میں دنیا کے مختلف خطوں میں ایسے معالج اور مفکر بھی سامنے آئے جن کی میراث صدیوں تک تہذیبوں کی رہنمائی کرتی رہی۔

چین میں، سائی لون (Cai Lun) نے قریب ۱۰۵ء میں کاغذ سازی کے عمل کو بہتر اور معیاری بنایا، جس نے ذرائع ابلاغ کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ ژانگ ژونگ جِنگ (Zhang Zhongjing)، جنہیں اکثر "چین کا بقراط" کہا جاتا ہے (دور: قریب ۱۵۰ تا ۲۱۹ء)، نے عوارضِ سردی پر رسالہ تحریر کیا، جو چینی طب کے لیے صدیوں تک ایک رہنما متن رہا۔

ہندوستان میں، چرک سمہیتا (Charaka Saṃhita)، جو ۱۰۰ء سے ۲۰۰ء کے درمیان کسی وقت گزرنے والے حکیم چرک سے منسوب ہے، آیورویدک کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

رومی دنیا میں حکیم جالینوس (Galen) نے، جس کا زمانہ لگ بھگ ۱۲۹ تا ۲۱۶ء ہے، بقراط کے طبی خیالات کو یکجا کر کے ایک مربوط نظامِ طب تشکیل دیا، جو اگلے ہزار سال تک یورپ اور اسلامی دنیا دونوں میں رائج رہا۔

فلکیات اور جغرافیہ کے میدان میں اسکندریہ کے بطلیموس (Claudius Ptolemy) نے، جس کا زمانہ قریب ۱۰۰ تا ۱۷۰ء ہے، المجسطی تصنیف کی جو صدیوں تک دنیا بھر میں علمِ کائنات کی بنیادی تصنیف سمجھی جاتی رہی۔ بطلیموس کی دوسری تصنیف جغرافیہ میں نقشہ سازی کا وہ باقاعدہ طریقہ پیش کیا گیا جو بعد کی تہذیبوں پر اثر انداز ہوتا رہا۔

ریاضی کے شعبے میں اسکندریہ ہی کے ڈیوفینٹس (Diophantus) نے ۲۵۰ء کے قریب الجبرا میں ابتدائی نوعیت کی کاوشیں کیں جو اُس زمانے میں تو مشہور نہ ہوئیں مگر بعد میں اسلامی اور یورپی مفکرین کے لیے تحریک کا ذریعہ بنیں۔ ایک صدی بعد، اسکندریہ ہی سے ایک اور عالم، پینڈروشن (Pandrosion) نے، جسے اکثر ایک عورت مانا جاتا ہے، جیومیٹری کے اصولوں میں اہم اضافے کیے۔

اس کے برعکس بحیرۂ روم کی دنیا ہی کے کچھ حصوں، خاص طور پر اسکندریہ اور دیگر علمی مراکز میں، دوسری طرح کے فکری رجحانات بھی اُبھر رہے تھے۔ باطنیت (Gnosticism) کا عقیدہ یہ تھا کہ نجات ایک پوشیدہ علم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اور مادی دنیا اکثر ناقص یا سراسر برائی کا نتیجہ ہے۔

ایک اور مکتبِ فکر نوافلاطونیت تھا، جس نے واضح شکل کچھ عرصے بعد فلوطین

(Plotinus) کے ذریعے حاصل کی، جس کا زمانہ قریب ۲۰۴ سے ۲۷۰ء ہے۔ افلاطون کے خیالات پر قائم اِس نظریے کے مطابق تمام حقیقت ایک واحد، کامل مصدر سے جاری ہوتی ہے اور روح کو مادی دنیا سے رُخ موڑ کر اُس طرف توجہ دینی چاہیے۔

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں افلاطون کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں، ایسے کھوکھلے مگر بظاہر دلفریب نظریات رُوحانیت کے مقصد کو فوت کر کے انصاف، جدوجہد اور عمل کی جڑیں کاٹ سکتے ہیں۔ لہٰذا مسیحی دنیا بھی اِن اثرات سے محفوظ نہ رہی۔ طرح طرح کی تفسیریں جنم لینے لگیں جو ایک دُوسرے کی مخالف تھیں۔ قریب ۱۴۴ عیسوی میں مارسیئن (Marcion) نامی ایک شخص نے یہودی صحائف کو مسترد کر دیا اور مسیحی پیغام کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کی۔

ذمہ دار مسیحی رہنماؤں نے ۲۰۰ء کے قریب اِس فکری بحران پر قابو پانے کی کوششوں کا آغاز کیا لیکن اُس سے پہلے ہی ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا تھا۔ اکثر دُوسرے مذاہب میں وحدت پہلے اُستوار ہوئی اور فرقہ وارانہ تقسیم بعد میں پیدا ہوئی۔ لیکن اُس کے برعکس مسیحیت میں وحدت قائم ہونے سے پہلے ہی فرقے وجود میں آ گئے۔

دوسری جانب یہودیت میں بھی ہیکل کے مٹ جانے کے بعد مذہبی زندگی کو ازسرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت پڑی تھی۔ وہاں ربّیائی یہودیت (Rabbinical Judaism) کی روایت نے جنم لیا، جس کا محور اساتذہ (ربّی)، عبادت گاہیں (synagogues) اور تورات کا مطالعہ تھا۔ یہودی تصوف (Jewish Mysticism) نے بھی نسبتاً واضح صورت اختیار کی، جس میں خدائی تخت اور آسمانی دنیا کے روحانی مشاہدات شامل تھے۔

پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

آہستہ آہستہ دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی مستحکم حکومتیں اُبھرنے لگیں جو کم سے کم دو تین سو سال تک قائم رہنے والی تھیں۔ ان میں فارس، برِصغیر، افریقہ اور عرب کے بعض خطے، جنوب مشرقی ایشیا، جاپان اور وسطی امریکہ شامل تھے۔

۲۲۴ء میں ساسانی بادشاہ اردشیر اوّل نے طویل عرصے سے قائم اشکانی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور فارس میں ساسانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ نئی سلطنت تیزی سے مشرق کی طرف پھیلتی گئی، حتیٰ کہ بلوچستان اور مکران جیسے علاقوں تک جا پہنچی۔ اس عہد کی ایک نمایاں مثال اُتھل (مکران) میں قائم چمن محل کی قلعہ نما تعمیرات ہیں، جو قریب ۲۶۰ء میں وجود میں آئیں۔ ان میں اشکانی اور ایرانی اثرات کو مقامی روایات کے ساتھ بڑے شاہانہ انداز میں ہم آہنگ کیا گیا۔

برِصغیر میں قریب ۳۲۰ سے ۵۰۰ء کا زمانہ گپتا سلطنت کے عروج کا زمانہ تھا، جس کے حکمران پکے ہندو تھے۔ یہ سلطنت شمالی، وسطی ہندوستان، مشرقی پنجاب اور سندھ کے بعض علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نقطۂ عروج چندر گپت دوم کے دورِ حکومت (قریب ۳۷۵ تا ۴۱۵ء) میں آیا، جسے وکرمادتیہ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

افریقہ کے مشرقی کونے میں (موجودہ ایتھوپیا، اریٹیریا، جبوتی اور صومالیہ کے کچھ حصوں) میں ۱۰۰ ق م کے بعد سے کئی خودمختار ریاستیں جنم لینے لگی تھیں۔ قریب ۳۳۰ء میں اکسوم کی سلطنت غالب آ گئی، جب اُس کے بادشاہ نے عیسائیت قبول کی، اپنا اثر و رسوخ دوسرے علاقوں تک بڑھایا اور بحیرۂ قلزم سے بحرِ ہند تک تجارتی راستے قائم کیے جو مزید دُور دراز علاقوں تک جا پہنچے۔ یہ سلطنت ۹۴۰ء تک قائم رہی اور اُس کے حکمرانوں کا

رسمی لقب نجاشی (Negus)، جس کا مطلب مقامی زبان میں ''بادشاہ'' ہے، اسلامی تاریخ میں آج تک زندہ ہے کیونکہ ابتدائی دور میں بعض صحابہ کرامؓ کو یہیں پناہ ملی تھی۔

اُدھر موجودہ یمن میں، حِمیر کی سلطنت (۱۱۰ق م تا ۵۲۵ء) قریب ۳۰۰ء میں اپنی ترقی کی معراج کو پہنچی۔ جبکہ جنوب مشرقی ایشیا میں موجودہ ویتنام، کمبوچیا اور تھائی لینڈ کے بعض علاقوں پر مشتمل فُنان کی سلطنت (قریب ۵۰ تا ۵۵۰ء) کو ۲۵۰ء کے لگ بھگ اپنا عروج حاصل ہوا۔

جزائر کے اُس مجموعے میں جو آج جاپان کہلاتا ہے، قریب ۲۵۰ سے ۷۱۰ء کے دوران یاماتو (Yamato) نامی حکومت نے ریاست کی ابتدائی بنیادیں رکھیں جو آگے چل کر شاہی نظام اور شنٹو (Shinto) ثقافتی روایات کا پیش خیمہ بنیں۔

اور دُوسری طرف، وسطی امریکہ میں، قریب ۳۰۰ء وہ زمانہ ہے جب مایا تہذیب کا کلاسیکی دور شروع ہوا— ایک ایسا دور جس میں شہری مراکز اُبھرے، تہذیبی نفاست بڑھی، اور فنِ تعمیر کے حیرت انگیز نمونے وجود میں آئے۔

*

اِس عام استحکام کے زمانے میں بھی جو بڑی حکومتیں مزید بکھرتی رہیں اُن میں چین اور روم کی حکومتیں نمایاں تھیں۔ چین میں ۲۲۰ء میں ہان سلطنت کے زوال پانے کے بعد طویل مدت تک سیاسی انتشار جاری رہا۔ رومی سلطنت ۱۹۳ء میں تاج و تخت سرِعام نیلام ہوئے تھے اور سب سے اونچی بولی لگانے والے کی جھولی میں ڈال دیئے گئے تھے، جس کے بعد سے کئی حکمراں قتل ہوئے، تخت سے اُتارے گئے یا جنگ میں مارے گئے۔

۲۸۵ء میں سلطنت کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ایک صدی بعد

۳۹۵ء میں یہ تقسیم مستقل حیثیت اختیار کر گئی۔ آیندہ نسلوں نے مشرقی رومی سلطنت کو بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) کا نام دیا اگرچہ یہ نام اُس سلطنت کے اپنے زمانے میں کبھی اُس کے لیے استعمال نہیں ہُوا۔

*

اُس زمانے میں جن سلطنتوں نے عروج اور استحکام دیکھا، وہاں سیاسی اتحاد کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی مستحکم ہوئی۔

برِصغیر میں گپتا سلطنت نے برہمن پرستی کو از سرِ نو زندہ کیا، اس کی حیثیت بلند کی اور ذات پات کے نظام کو سیاسی ڈھانچے میں مزید گہرائی سے پیوست کر دیا۔

ساسانی ایران میں، سیاسی مرکزیت کے ساتھ زرتشتیت (پارسی مذہب) کی ایک زوردار اصلاحی تحریک بھی چلائی گئی، جس نے اس مذہب کو ایک لچکدار روایت کے زمرے سے نکال کر ریاستی سرپرستی میں چلنے والے مذہب کی شکل دے دی۔ اجتماعی یادداشت کو نئی صورت دینے کے لیے تاریخ کو از سرِ نو لکھا گیا اور سائرس اعظم کے نام کو تاریخ سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔

مگر اُسی سرزمین سے روحانیت کا ایک اور دعویدار بھی اُبھرا۔ یہ مانی (قریب ۲۱۶ تا ۲۷۴ء) تھا، جس نے ایک نیا مذہب، مانویت (Manichaeism) پیش کیا۔ اُس میں عیسائیت، بدھ مت اور زرتشتیت کے عناصر کو سمو کر ایک ثنویت (dualism) تشکیل دی گئی، یعنی کائنات کو دو متضاد قوتوں، روشنی اور تاریکی، روح اور مادّے کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ یہ تقسیم کچھ ایسی تھی کہ اِس میں کسی وحدت کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے انسان کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ روحانی ارادے سے مادی دنیا کو بدل سکے۔ اگرچہ مانی کو ساسانی

حکام نے سزائے موت دی مگر اُس کا مذہب بڑی تیزی کے ساتھ ساسانی سلطنت کے علاوہ رومی دنیا، وسطی ایشیا اور پھر چین تک جا پہنچا۔

*

اسی دوران میں رومی شہنشاہ قسطنطین اوّل (دورِ حکومت: ۳۰۶ تا ۳۳۷ء) نے، جسے قسطنطینِ اعظم بھی کہا جاتا ہے، بکھرتی ہوئی رومی سلطنت کو جوڑنے کے لیے مسیحیت سے اُمید باندھی۔

۳۱۳ء میں قسطنطین نے مسیحیت کو قانونی تحفظ دیا اور ۳۲۵ء میں سلطنت بھر کے بشپوں اور مذہبی عمائدین کو نائسیا (موجودہ ترکی) میں جمع کیا تاکہ عقائدی اختلافات کو سلجھایا جا سکے۔ اُس وقت تک مسیحیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کے بارے میں کئی نظریے رائج تھے۔ کچھ اُنہیں الٰہی (یعنی ایک طرح سے خدا کی ذات کا حصہ) قرار دیتے تھے اور کچھ خدا کی مخلوق مانتے تھے۔ نائسیا کی کونسل نے باضابطہ طور پر یہ مؤقف اختیار کیا کہ عیسیٰ کی ذات، الٰہی جوہر میں خدا کے برابر ہے۔

یوں مسیحی عقائد کی رسمی تدوین کا آغاز ہوا۔ بعد کی کونسلوں نے کلیسائی قیادت کو سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کا حصہ بنایا اور یوں ایک روحانی تحریک جو شہر شہر گھومنے والے مبلغوں کے ذریعے پھیلی تھی، رفتہ رفتہ ایک ریاستی ادارہ بن گئی۔

مانویت، جسے ایران میں پہلے ہی دبایا جا چکا تھا، رومی سلطنت میں بھی ممنوع قرار دے دی گئی۔ پھر بھی یہ سمجھا گیا ہے کہ مانوی اثرات مسیحی مذہبی فکر میں داخل ہو گئے۔[1] مثلاً

---

[1] یہ خیال علامہ اقبال نے بھی خطبۂ الٰہ آباد میں ظاہر کیا ہے۔

آگسٹین آف ہپو(۳۵۴تا۴۳۰ء)، شمالی افریقہ کے ایک قصبے سے (جو موجودہ الجزائر میں واقع ہے) ایک بشپ تھے، جو عیسائیت قبول کرنے سے پہلے مانوی عقائد سے وابستہ رہے۔ اگرچہ بعد میں اُنہوں نے مانوی عقائد پر شدید تنقید بھی کی، لیکن اُن کے بعض تصوّرات میں مانوی ثنویت کی بازگشت محسوس کی جا سکتی ہے، جیسے روح اور جسم کے درمیان زبردست امتیاز یا خدا کے شہر اور انسان کے شہر کا مقابلہ، وغیرہ۔

اگرچہ مسیحی عقائد کے ارتقا میں آگسٹین کی خدمات قیمتی تھیں لیکن اُنہوں نے ایک ایسے تصوّرِ حیات کو بھی راسخ کر دیا جس میں روحانی دنیا کو فطری طور پر مادی دنیا سے برتر سمجھا جانے لگا جبکہ ابتدائی دَور کی مسیحی روایت نے روح اور مادّے کے درمیان اِس قسم کی تفریق کے بجائے اخلاقیات پر زیادہ زور دیا تھا۔

بہرام گور کا زمانہ

ایران میں ساسانی سلطنت نے ایک نئے ثقافتی دَور کا عروج اُس وقت دیکھا جب بہرام پنجم (دورِ حکومت: ۴۲۰تا۴۳۸ء)، جسے بہرام گور کے نام سے جانا جاتا ہے، اقتدار میں آیا۔

تاریخی طور پر بہرام فنونِ لطیفہ کا سرپرست، زرتشتی مذہبی اداروں کا محافظ اور اُس زمانے کے بڑھتے ہوئے خطرات کے درمیان ایران کی خودمختاری کو قائم رکھنے والے حکمران کے طور پر مشہور ہے۔ لیکن اُس کی ہمیشہ رہنے والی شہرت اُن رنگوں کی وجہ سے ہے جو اُس کی وفات کے تقریباً آٹھ سو برس بعد فارسی کے عظیم شاعر نظامی گنجوی نے اُس کے ساتھ وابستہ کر دیئے۔

نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر (۱۱۹۷ء) میں بہرام ایک ''سننے والے بادشاہ'' کے

مثالی رُوپ میں سامنے آتا ہے۔ اُس کہانی میں سات دُور دراز ملکوں کی سات شہزادیاں بہرام کو سات الگ الگ دنوں میں کہانیاں سناتی ہیں۔ یہ کہانیاں اخلاقی سچائیوں، چھپی خواہشوں اور انسانی روح کی تہہ دار ساخت کو عیاں کرتی ہیں۔

یہ سننے کا علامتی عمل، جو طاقت سے فرار نہیں بلکہ طاقت کے باطن میں ایک اخلاقی طرزِ فکر کی دریافت ہے، بہرام کو غور و فکر کرنے والے ایک ایسے حکمراں کے طور پر پیش کرتا ہے جو شعر و حکمت اور اقتدار کے سنگم پر کھڑا ہے، دونوں سے روشنی حاصل کرتا ہے اور دونوں پر اثر ڈالتا ہے:

نفَسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر[1]

جس طرح بہرام کو بعد کی شاعری میں سات شہزادیوں سے کہانیاں سنتے دکھایا گیا، اُسی طرح اُس زمانے کے چینی سچ مچ میں اپنے ایک سیاح سے بودھ علاقوں کی داستانیں سن رہے تھے۔ اُن علاقوں میں ٹیکسلا، سوات اور گندھارا سمیت موجودہ پاکستان کے بہت سے مقامات شامل تھے، اور سیاح کا نام فاہیان (Faxian) تھا۔

فاہیان نے ۳۹۹ سے ۴۱۴ء کے درمیان ان علاقوں کا سفر کیا اور اپنی روداد بُودھ ممالک کی سیر میں تحریر کی۔ اُس نے ایسے شہروں کا نقشہ کھینچا جو خانقاہوں کی روحانیت، عظیم سٹوپوں کی شان اور زہد و عبادت کی فضا سے معمور تھے۔ ٹیکسلا کے عروج کا زمانہ اگرچہ گزر چکا تھا لیکن پھر بھی وہ علم اور عبادات کا ایک نمایاں مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ایک صدی بعد، قریب ۵۱۸ء میں، راہب سونگ یون (Song Yun) کی سربراہی میں چین کا ایک مذہبی و سفارتی وفد بھی ان علاقوں میں آیا۔

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۱۹

دُور برطانیہ میں، جہاں سے ۴۱۰ء میں رومی افواج واپس جا چکی تھیں، ایک اور قسم کا بادشاہ اجتماعی یادداشت میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ کنگ آرتھر تھا، جو نیم تاریخی اور نیم افسانوی شخصیت ہے، اور بعد کے زمانے میں انگلستان کے دیومالائی ادب کا ایک زندہ و جاوید کردار بن چکا ہے۔ موٴرخین کو اِس بات میں شبہ ہے کہ وہ کبھی حقیقی وجود رکھتا تھا لیکن اُسے اُس تخیل کی علامت ضرور سمجھا گیا ہے جو رُومیوں کے جانے کے بعد جزیرۂ برطانیہ میں جنم لے رہا تھا۔ اُن روایات میں آرتھر بھی ایک "سننے والا بادشاہ" بن گیا جو اپنی گول میز کے گرد بہادروں کو جمع کرتا ہے، جن میں سے ہر ایک کی آواز کو برابری کی اہمیت حاصل ہے۔

*

عظیم سلطنتوں کی سرحدوں پر خانہ بدوش اور سرحدی اقوام کے غول اُبھر رہے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ مشہور گوتھ تھے، جو بعد میں دو شاخوں میں تقسیم ہو گئے، اور آج کے اٹلی، اسپین اور بلقان کے کچھ حصوں میں اپنی سلطنتیں قائم کیں۔

ہُن کچھ اور جنگجو قبائل کا ایک کنفیڈریشن تھے، جو ممکنہ طور پر وسطی ایشیا سے نکلے تھے اور اپنے سردار اتیلا (دورِ حکومت: ۴۳۴ تا ۴۵۳ء) کی قیادت میں یورپ کے سب سے خوفناک حملہ آوروں کے طور پر پہچانے گئے۔

وانڈلز قبائل نے، جو آج کے وسطی یورپ سے تعلق رکھتے تھے، ۴۳۵ء تک شمالی افریقہ میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی اور ۴۵۵ء میں روم کے شہر کو لُوٹ لیا۔

۴۷۶ عیسوی میں جرمن قبائل کے ایک سالار نے مغربی رومی سلطنت کے آخری شہنشاہ کو معزول کر دیا اور یوں کئی صدیوں تک تاریخ پر چھائی رہنے والی یہ سلطنت بالآخر

اپنے انجام کو پہنچی۔

اسی دوران سفید ہن، جنہیں ہفتالی یا ہیپتھلائٹس بھی کہا جاتا ہے، وسطی ایشیا سے اُبھرے۔ ۴۸۴ء میں اُنہوں نے ایک جنگ میں ساسانی شہنشاہ فیروز اوّل کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ اُنہوں نے گندھارا کے اہم مراکز پر بھی قبضہ کیا اور برِصغیر پر بار بار حملے کر کے گپتا سلطنت کو قریب ۵۰۰ء میں ختم کر دیا۔

زوال کی دہلیز

قدیم دنیا جیسے ٹھٹھک ٹھٹھک کر اپنے مکمل خاتمے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ "آؤ، ذرا ٹھہریں اور اِن کھنڈرات پر آنسو بہالیں جہاں کبھی اُس حسینہ کی موجودگی کی آگ دہک رہی تھی،" اُس عہد کے سب سے مشہور عرب شاعر امرا ألقیس (اندازاً ۵۰۰ تا ۵۴۰ء) نے لکھا۔ "ہواؤں نے اُس کے قدموں کے نشانات کو مٹا دیا ہے اور بارشوں نے اُس کے نام کی روشنائی دھندلا دی ہے۔"

وہ اقوام جو کبھی وحشی سمجھی جاتی تھیں، اب دنیا کے کئی حصوں میں مستقل سکونت اختیار کر رہی تھیں۔ ایک نمایاں مثال فرینک تھے، جنہوں نے اپنے بادشاہ کلووس کے دَورِ حکومت (۴۸۱ تا ۵۱۱ء) میں مسیحیت قبول کر کے اُس عمل کا آغاز کیا جس نے آگے چل کر جدید فرانس کو جنم دیا۔

تاہم یہ اُبھرتی ہوئی طاقتیں ابھی مستحکم سیاسی نظم قائم کرنے سے کوسوں دُور تھیں۔ رومی سلطنت کے بعد کا یورپ، اور دنیا کے کئی دوسرے خطے، اب بھی قبائلی جنگ و جدل اور بدنظمی کا شکار تھے۔ برِصغیر میں گپتا سلطنت کے زوال کے بعد کئی مقامی حکمراں ابھر

آئے جو اکثر باہمی لڑائیوں اور داخلی کشمکش میں اُلجھے رہتے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کا حال اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ وہاں قبائل کے درمیان طویل اور خونریز جنگیں ہوتی رہتی تھیں جو اکثر معمولی اور سطحی وجوہات پر بھڑک اٹھتی تھیں، جیسا کہ مولانا حالی نے اپنے لازوال الفاظ میں بیان کیا ہے:

کہیں تھا مویشی چَرانے پہ جھگڑا　　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　　کہیں پانی پینے پِلانے پہ جھگڑا
یونہیں روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

*

زندگی جیسے قدیم دنیا کے خاتمے اور ایک نئی دنیا کے اہتمام کی خاطر مختلف تہذیبوں میں ایسی عبوری شخصیات کو بھی جنم دے رہی تھی جنھوں نے ماضی کی میراث کو اِس طرح محفوظ کیا کہ وہ اُس دنیا میں کام آسکے جو ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

چین میں بُودھ راہب اور مفکر ژئی (Zhiyi) نے، جس کا زمانہ ۵۳۸ سے ۵۹۷ء ہے، تینتائی روایت کو ایک باقاعدہ مکتبِ فکر میں ڈھالا جو بعد میں مشرقی ایشیا میں بدھ مت کی فکری تشکیل پر صدیوں تک اثر انداز ہوا۔

ہندوستان میں آریہ بھٹ (اندازاً ۴۷۶ تا ۵۵۰ء) نے زمین کی گردش کا نظریہ پیش کیا اور اعشاری نظام کے اُن تصوّرات کو تشکیل دیا جو بعد میں مسلمانوں کے ذریعے الجبرا، فلکیات اور مثلثیات کی بنیاد بنے۔

مٹتی ہوئی یونانی اور رومی دنیا میں بوئیتھیوس (اندازاً ۴۸۰ء تا ۵۲۴ء) نے قدیم

مابعد الطبیعیاتی فلسفے کی میراث کو اِس انداز میں محفوظ کیا کہ وہ آگے چل کر مسیحیت کے مدرسی فلسفے کی بنیاد بن گئی۔

عرب کے صحراؤں میں اُس زمانے میں چند ایسی شخصیات گزریں جنہیں بعد کی اسلامی روایت نے گفتار یا کردار کے نمونوں کے طور پر احترام کے ساتھ یاد رکھا۔ شاعر اور جنگجو عنترہ بن شداد (اندازۃً ۵۲۵ تا ۶۰۸ء) کو اُس کی وفات کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے سراہا، جس کی وجہ عنترہ کا یہ شعر تھا کہ ”مَیں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ مَیں رزقِ حلال کے قابل ہو سکوں۔“

قبیلہ طے کا سردار حاتم، جس کا زمانہ ۵۰۰ء سے ۶۰۰ء کے درمیان کا ہے، سخاوت کا استعارہ بن کر مسلم روایت کا حصہ بنا۔

حضرت عبد المطلب (اندازۃً ۴۹۷ تا ۵۷۸ء)، اُن کے بیٹے حضرت عبد اللہ (اندازۃً ۵۴۶ تا ۵۷۰ء) اور اُن کی بہو آمنہ بنت وہب (اندازۃً ۵۴۹ تا ۵۷۷)، جو بالترتیب پیغمبر اسلامؐ کے دادا، والد اور والدہ تھے، مسلمانوں کے لیے سیرت و کردار کے قابلِ احترام نمونے قرار پائے۔

کرۂ ارض کے دوسری طرف جو خطّے ابھی تک باقی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھے، اُن میں سے امریکہ میں عظیم شہر ٹیوٹیہواکان (Teotihuacan) اپنے عروج کے قریب تھا، جس کے ثقافتی اثرات بعد کی مایا، ٹولٹیک اور ایزٹیک تہذیبوں میں سنائی دیئے۔ شمال کی طرف، وادیِ مسیسیپی میں مکئی کی بنیاد پر زرعی نظام پھیلنے لگا، جو بعد میں پیچیدہ معاشروں کی بنیاد بنا۔

بحر الکاہل کے اُس پار، پولینیسی ملاح، جن کا تعلق بحر الکاہل کے جنوبی و وسطی جزیروں سے تھا، وسیع سمندری فاصلوں کو حیرت انگیز مہارت سے طے کر کے ہوائی اور مار کو ساس

جیسے دُور دراز جزائر میں آباد ہو رہے تھے۔

ایران میں ۴۹۰ء کے لگ بھگ سماجی مساوات کا ایک انتہاپسندانہ نظریہ سامنے آیا جس نے آیندہ آنے والی صدیوں میں بعض باغیوں اور انقلابیوں کو متاثر کیا۔ یہ نظریہ، جسے مزدکیت کہتے ہیں، ایک زرتشتی پیشوا مزدک سے منسوب کیا جاتا ہے (اگرچہ بعض مؤرخین اس کی تاریخی حیثیت پر سوال اٹھاتے ہیں)۔ اس میں تمام املاک، یہاں تک عورتوں کو بھی اجتماعی ملکیت قرار دیا گیا۔ کچھ عرصے اثر رسوخ حاصل کرنے کے بعد ۵۲۸ء میں شہنشاہ نوشیرواں کے ہاتھوں، جس کا مزید تذکرہ آگے آنے والا ہے، یہ تحریک سختی سے کچل دی گئی۔

مسیحی دنیا میں اُسی عہد میں خانقاہیں وجود میں آنے لگیں۔ یہ ایسے مذہبی مراکز تھے جہاں راہب یا راہبات عبادت، مطالعہ، تدریس، علاج معالجے اور مسافروں کی خدمت جیسے کاموں کے لیے خود مختار ماحول میں رہتے تھے۔ جب بت پرستی ماند پڑنے لگی تو ایسے مراکز پورے یورپ کے دیہی علاقوں میں عقیدت اور ضبطِ نفس کی علامت کے طور پر پھیل گئے۔

*

عبوری شخصیات اور تمام مثبت رجحانات کے باوجود دنیا کو وہ وحدت میسر نہ آسکی جس کی اُسے اشد ضرورت تھی۔ عیسائیت خود فرقوں میں بٹ چکی تھی جو اکثر ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اُس عہد کے تین سب سے زیادہ طاقتور افراد، جو خود بھی قدیم دنیا اور آنے والے جہان کے درمیان پُل کی حیثیت رکھتی تھیں، ہم آہنگی پیدا نہ کرسکے۔ یہ تین افراد تھے بازنطینی سلطنت کے مشترکہ حکمران، شہنشاہ جسٹینیئن اوّل (دورِ حکومت ۵۲۷–تا

۵۶۵ء) اور ملکہ تھیوڈورا (متوّفی ۵۴۸ء) اور ساسانی سلطنت کا شہنشاہ خسرو اوّل اَنُوشِیروَان (دورِ حکومت ۵۳۱ تا ۵۷۹ء)، جسے نوشیروانِ عادل کے نام سے یاد رکھا جاتا ہے۔ اُس کا لقب خسرو، جسے عرب کسریٰ کہتے تھے، بعد کی اسلامی شاعری میں شاہانہ جاہ و جلال کی علامت بن گیا۔

جسٹینیئن اور تھیوڈورا مرکزیت، اپنے فرقے کے مسیحی عقائد اور روم کی کھوئی ہوئی عظمت کی بحالی کے لیے پرعزم تھے۔ اُن کے حکم پر رومی قوانین پر مبنی وہ مجموعہ تیار ہُوا جو آگے چل کر صدیوں تک یورپ کے قانونی تصورات پر اثرانداز ہوتا رہا۔ لیکن اُس زمانے میں اُس پر بھی یکسانیت کے ساتھ عملدرآمد نہ ہو سکا۔

اِن دونوں حکمرانوں کی تعمیراتی مہمات میں آیاصوفیہ (Hagia Sophia) کی تیسری اور حتمی عمارت بھی شامل تھی، جو ۵۳۷ء میں مکمل ہوئی۔ اُس کا بلند و بالا گنبد، اور اُس کے معمار ایسیدور آف میلائٹس کی ایجاد کی ہوئی روشنی اور آواز کی جمالیات بعد میں اسلامی طرزِ تعمیر میں شامل ہوئے۔

مگر جسٹینیئن کی مغربی علاقوں کو واپس لینے کی فوجی مہمات نے سلطنت کے وسائل نچوڑ دیے، کئی خطوں کو تباہ کر دیا اور روم جیسے شہروں کو کھنڈر بنا چھوڑا۔ جسٹینیئن نے مذہبی اختلافات کو بھی سختی سے دبایا اور کالسیڈونی عقائد کو زبردستی نافذ کیا، جس کی وجہ سے خاص طور پر مصر اور شام میں فرقہ وارانہ تناؤ بڑھا، جہاں قسطنطنیہ کے خلاف پہلے ہی ناپسندیدگی پائی جاتی تھی۔

نوشیرواں زرتشتی مذہب، انتظامی اصلاحات اور سلطنت میں طاقت و نظم کی بحالی کے لیے پُرجوش تھا اور علمی سرگرمیوں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ وہ ایک عظیم قانونی اصلاحات کی مہم کا نگران بھی تھا۔ زرتشتی اور اسلامی روایات میں وہ آج تک ایک انصاف

پسند بادشاہ کے استعارے کے طور پر زندہ ہے۔ تاہم اُس کی اصلاحات معقول ہونے کے باوجود عملی طور پر عام رعایا کے لیے ایک بوجھ بن گئیں۔

عیسائیوں اور دُوسری مذہبی اقلیتوں کو ساسانی سلطنت میں جینے کی اجازت تھی لیکن اُن پر وقتاً فوقتاً پابندیاں عائد ہوتی رہیں، اور ان کے لیے گزر بسر مشکل تر ہوتی گئی۔

۵۴۰ سے ۵۶۲ء کے درمیان جسٹینیئن اور نوشیرواں کی سلطنتیں وقفے وقفے سے ایک دوسرے کے خلاف جنگوں میں الجھی رہیں۔ ان جھڑپوں میں مسیحیت اور زرتشتیت کی مذہبی رقابت کی جھلک بھی تھی اور بیچ میں پھنسے ہوئے عام لوگ محض اپنے عقیدے یا نسل کی وجہ سے قتلِ عام، غلامی اور جبری ہجرت جیسے مظالم کے شکار ہُوئے۔

دونوں دیو ہیکل سلطنتوں کے درمیان پِسی ہوئی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں بار بار ٹوٹتی، بکھرتی اور دوبارہ ابھرتی رہیں لیکن استحکام اور ہم آہنگی کہیں پیدا نہ ہو سکی۔

ایسے سرحدی علاقوں، بصریٰ، سینا، ادیسہ اور دیگر مقامات پر بسنے والے راہب سوچنے لگے تھے کہ کیا وہ وقت نہیں آن پہنچا جب مسیحؑ کو دوبارہ آنا تھا؟

بعض مسیحی مصنفین بہت پہلے یہ پیشگوئی کر چکے تھے کہ یہ واقعہ عین اُن کے پیدائش کے پانچ سو سال بعد ہو گی (جو اُس وقت ۵۰۰ء سمجھی جاتی تھی)۔ اگرچہ رومی کلیساؤں کے حکام نے مسیحؑ کی واپسی کا وقت متعین کرنے کی کوششوں سے گریز کرنے کی تلقین کی تھی لیکن اِن سرحدی علاقوں کے راہب ایسی قیاس آرائیوں میں مشغول رہے۔ جنگی علاقوں کے بیچ رہتے ہوئے اور قتل و غارت کو دیکھتے ہوئے یہ راہب سیاسی واقعات کو خدائی اشاروں کے طور پر سمجھنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

مگر اب ۵۰۰ء کی تاریخ بھی گزر چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ بعض راہبوں نے سوچا ہو کہ کیا معلوم، پانچ سو سال کی گنتی مسیحؑ کی ولادت سے نہیں بلکہ یروشلم کے معبد کی تباہی سے

شروع کرنی چاہیے، جو ۷۰ء میں ہوئی تھی؟ ۵۷۰ء میں اُس تباہی کو پانچ سو سال پورے ہو رہے تھے اور یہ لمحہ قیامت کے امکانات سے لبریز بھی نظر آ رہا تھا۔ نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

باب ۷

نئی منزلیں، نئے راستے

۵۷۰ء سے ۷۵۰ء

عرب کا جزیرہ نما ہزاروں برس تک تاریخ کے کنارے پر رہا۔ فاتحین کے نزدیک یہ خطہ اتنا بنجر تھا کہ اس پر توجہ دینے کی ضرورت نہ تھی اور اتنا دشوار گزار ہونے کی وجہ سے قریباً ناقابلِ عبور بھی تھا۔ خود اِس کے اپنے قبائل باہمی اختلافات کی وجہ سے اِس قابل نہ تھے کہ اجتماعی طور پر اُبھر سکتے:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا — کہیں پانی پینے پِلانے پہ جھگڑا
یونہیں روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں [1]

اگرچہ یہودیت، عیسائیت، اور دیگر مذاہب کے اثرات علاقے میں پہنچ چکے تھے لیکن بیشتر عرب ابھی تک مشرک تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مکہ کے مغربی حصے میں ایک عظیم عبادت گاہ کعبہ تعمیر

[1] یہ اشعار مولانا حالی کی مسدس مدوجزرِ اسلام سے ہیں۔

کی جو ابتدا میں صرف خدا کے لیے وقف تھی، جسے عربی میں اللہ کہا جاتا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس میں اور اُس کے اطراف میں دیوی دیوتاؤں کے بت رکھ دیئے گئے تھے جن کی تعداد مشہور روایت کے مطابق تین سو ساٹھ تک پہنچ گئی۔ ہر سال سارے عرب سے قبائل یہاں حج کے لیے جمع ہوتے تھے۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش مکہ میں تقریباً ۵۷۰ء میں ہوئی۔ قریش قبیلے کے ایک معزز خانوادے بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے لیکن کم سنی میں ہی یتیم ہو گئے اور زندگی کا آغاز نہایت سادہ حالات میں کیا۔ ابتدا میں ایک تاجر کے طور پر کام کیا اور جلد ہی اپنی سچائی، دیانتداری، اور خاموش و مستقل شفقت جیسی نمایاں صفات کے لیے معروف ہو گئے۔

تقریباً ۶۱۰ء میں، جب آپؐ کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی، آپؐ نے اپنے خاندان والوں اور قریبی دوستوں کو بتایا کہ خدا نے انہیں اپنا نبی مقرر کیا ہے۔ پیغام سادہ تھا: "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے؛ محمد اللہ کے رسول ہیں" (لا الٰہ الا اللہ محمد الرّسول اللہ)۔ لیکن صرف سات الفاظ پر مشتمل یہ دو جملے، جنہیں 'کلمۂ طیبہ' کہا جاتا ہے، سب کچھ بدل کر رکھ دیتے ہیں:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صَوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی[1]

صرف کلمۂ طیبہ کو قبول کر لینے سے ایک فرد مسلم برادری کا مکمل رکن بن جاتا ہے۔ اصولی طور پر یہ برادری ایک خاندان کی طرح ہے جہاں سب برابر ہیں۔ دنیاوی حالات کے تقاضوں کی وجہ سے اگر کوئی اونچ نیچ ہو تو مسلمان معاشروں کا فرض ہے کہ بتدریج اُسے کم کر کے مکمل مساوات کی طرف بڑھتے رہیں۔ مثلاً غلامی کو فوراً ختم نہیں کیا گیا لیکن یہ اصول

---

[1] یہ شعر بھی مولانا حالی کی مسدس مدوجزرِ اسلام سے ہے۔

ضرور وضع کر دیا گیا کہ غلاموں کو بھی شہری حقوق حاصل ہیں۔ چنانچہ اقبال کے مطابق، ”عملی اعتبار سے توحید کا سب سے اہم پہلو مساوات، اخوّت اور آزادی بنتا ہے“[1] اور ”پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت کا مقصد اخوت، مساوات، اور آزادی کو عالمی سطح پر رائج کرنا تھا۔“[2]

جس طرح اسلام کے یہ دونوں بنیادی عقائد یعنی توحید اور رسالت، کلمۂ طیبہ سے بر آمد ہوتے ہیں، اُسی طرح بقیہ عقائد بھی انہی کی تشریح سے قدرتی طور پر سامنے آتے ہیں: خدا پر ایمان؛ تمام الہامی کتابوں پر ایمان؛ معلوم اور نامعلوم تمام پیغمبروں پر ایمان؛ فرشتوں کے وجود پر ایمان؛ اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور حساب کتاب پر ایمان۔

پانچ فرض عبادات بھی، جنہیں ارکانِ اسلام یعنی اسلام کے ستون کہا جاتا ہے، کلمۂ طیبہ ہی کی عملی صورتیں ہیں جو تقریباً بیس برس کے عرصے میں تدریجاً نافذ ہوئیں۔ پہلا ستون خود کلمے کا اقرار ہے۔ بقیہ چار یہ ہیں: نماز؛ رمضان کے مہینے میں روزے؛ زکوٰۃ یعنی مال کا ایک حصہ مستحقین کو دینا؛ اور حج یعنی خانۂ کعبہ کا طواف اور اُس کے قریب مقدس مقامات پر بعض رسومات ادا کرنا جو وسائل دستیاب ہونے کی صورت میں زندگی میں ایک دفعہ لازم ہے۔

ان تمام عبادات میں سے حج کے سوا کسی اور عبادت کے لیے کسی مخصوص جگہ کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ پیغمبرؐ نے خود پوری زمین کو مسجد کی مانند قرار دیا۔ نہ ہی کسی مقدس پیشوا کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ نماز باجماعت کی امامت بھی درحقیقت

---

[1] Iqbal, *Reconstruction,* p. 147: 'The essence of 'Tauhid' as a working idea, is equality, solidarity, and freedom.'

[2] اقبال، اسرار و رموز، ص۱۱۹: ”مقصودِ رسالتِ محمدیہؐ تشکیل و تاسیسِ حرّیت و مساوات و اخوّتِ بنی نوعِ آدم است“

دوسرے مذاہب کی طرح کوئی مخصوص پروہت نہیں کرواتا بلکہ موقع پر موجود مسلمان خود ہی کسی شخص کو اِس خدمت کے لیے منتخب کر لیتے ہیں (مساجد کے مستقل امام دُوسرے مذاہب کے برعکس کسی خاص روحانی استحقاق کی بنأپر نہیں بلکہ محض سہولت کی خاطر مقرر کیے جاتے ہیں)۔

وحی نازل ہونے کے بعد تین برس تک آنحضورؐ نے اپنا پیغام صرف قریبی حلقے تک مخصوص رکھا۔ اُس کے بعد تقریباً ۶۱۳ء میں اسے عام کرنا شروع کیا تو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مکہ اور باقی عرب کے مشرکین نے ایمان لانے والوں کو اذیتیں دیں یہاں تک کہ بعض کو شہید بھی کر دیا گیا۔ لیکن رسولؐ اپنے پیروکاروں کو بدلہ لینے سے منع فرماتے رہے۔

۶۱۹ء یا ۶۲۰ء کے آس پاس ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا جسے معراج یا اِسراء کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ایک ہی رات میں رسولِ اکرمؐ کو مکہ سے یروشلم اور وہاں سے آسمانوں کی طرف لے جایا گیا، جہاں اُنہوں نے سابقہ انبیائے کرام کی ارواح سے ملاقات کی، قدرت کے پوشیدہ اسرار کا مشاہدہ کیا اور خدا کے سامنے پہنچ کر خدا کا قرب حاصل کیا۔

تین برس بعد، ستمبر ۶۲۲ء میں، آنحضور اور اُن کے ساتھی قریبی شہر یثرب (مدینہ) کے باشندوں کی دعوت پر ہجرت کر کے وہاں تشریف لے گئے اور ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اِسی واقعے کو اسلامی کیلنڈر کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا۔

آنحضورؐ کے سب سے بڑے سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی نے معراج اور ہجرت کے درمیان ایک گہرے ربط کی نشاندہی کی ہے۔ پیغمبر نے آسمانوں میں ایک مثالی دنیا دیکھی اور ریاستِ مدینہ کے ذریعے پوری زمین کو اُس مثالی دنیا کے مطابق بنانے کے اُس عمل کا

آغاز کر دیا جو بتدریج مکمل ہو رہا ہے۔ اِس عمل کی بنیاد اُن ابتدائی اقدامات پر ہے جو پیغمبرِ اسلامؐ نے ہجرت کے فوراً بعد کیے تھے۔

مثلاً مدینہ میں بسنے والے مسلمانوں، یہودیوں اور دیگر مقامی قبائل کے درمیان ایک معاہدہ طے کیا جو ''میثاقِ مدینہ'' کہلاتا ہے۔ اس معاہدے میں تمام گروہوں کے حقوق اور فرائض کا تعین کیا گیا، جس کا مقصد اِس معاہدے کے اپنے الفاظ میں اُن تمام مذاہب کے لوگوں کو ملا کر ایک ''اُمتِ واحدہ'' قائم کرنا تھا۔

مکہ سے آنے والے اکثر مہاجرین خالی ہاتھ تھے، اس لیے آنحضورؐ نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک مقامی باشندے کا بھائی بنا دیا، جسے ''مواخاۃ'' کہتے ہیں۔ یہ مواخاتی بھائی سگے بھائیوں کی مانند سمجھے گئے اور کچھ عرصے تک ایک دوسرے کے ورثے میں بھی حصہ دار قرار پائے (وراثت میں یہ حصہ داری بعد میں ختم کر دی گئی جب اس کا مقصد پورا ہو گیا)۔ علامہ اقبال کے مطابق یہ واقعہ اسلامی معیشت کے اصل اصول کو ظاہر کرتا ہے:

> اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے فأصبحتم بنعمته اخوانا [''اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بن گئے''] میں اِسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول

بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کا مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔[1]

اگلے دس برسوں میں آنحضورؐ اور اُن کی اُمّت نے کئی مشکلات کا سامنا کیا جن میں قریشِ مکہ کے خلاف غزوات، مدینہ میں موجود منافقین اور یہود کی طرف سے میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزیاں اور دُوسرے عرب قبائل کے ساتھ تصادم بھی شامل تھے۔

۶۳۰ء میں آنحضورؐ ایک بڑے قافلے کے ساتھ پُرامن طور پر مکہ میں داخل ہوئے اور کسی بڑی خونریزی کے بغیر شہر فتح کر لیا۔ کعبہ سے تمام بُتوں کو ہٹا دیا گیا لیکن تمام دشمنوں کو عام معافی بھی دی گئی۔ اُس کے بعد آنحضورؐ واپس چلے گئے اور ہمیشہ کی طرح سادہ زندگی گزارتے رہے۔

۶۳۲ء تک، بیشتر عرب اسلام قبول کر کے متحد ہو چکا تھا۔ اُس سال پیغمبر نے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری حج کیا جو حجۃ الوداع کہلایا۔ حج کے اہم ترین دن ۹ ذوالحجہ ۱۰ھ (۶ مارچ ۶۳۲ء) کو خدا کی طرف سے وہ وحی موصول ہوئی جو سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں شمار کی جاتی ہے: ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔“ (مائدہ:۳)۔

اس کے کچھ مہینے بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ (۸ جون ۶۳۲ء) کو آنحضورؐ کی رحلت ہوئی۔ آپؐ کے قریبی دوست ابو بکر صدیقؓ ایک انتخاب کے ذریعے خلیفہ بنے اور عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ”اے لوگو! مجھے تم پر حکمرانی دی گئی ہے حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر مَیں صحیح کروں تو میری مدد کرنا۔ اگر مَیں غلطی کروں تو مجھے درست کر دینا۔“

---

[1] برنی، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۳-۴۵۷؛ بحوالہ زمیندار، ۲۴/جون ۱۹۲۳ء

انسانی تاریخ میں نبیوں کا زمانہ مکمل ہو چکا تھا اور وہ قدیم دنیا جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی، اب رخصت ہو رہی تھی۔

*

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نہ صرف قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ آنحضورؐ خدا کے آخری نبی ہیں بلکہ تاریخی طور پر بھی اُس کے بعد کسی مذہب نے اِتنی مقبولیت حاصل نہیں کی ہے کہ اُسے اسلام اور اُس سے پہلے کے مذاہب کی طرح ایک عالمی مذہب قرار دیا جائے۔ اسلام کے بعد آنے والے نئے مذاہب عام طور پر پہلے سے موجود کسی مذہب کی صحیح یا غلط تشریح کے طور پر ہی پیدا ہوئے ہیں اور عام طور پر محدود رہے ہیں۔

اقبال کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اِس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی انسانیت اپنی روحانی ترقی کی اُس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں اُسے کسی نئے نبی کی ضرورت نہ تھی اور پہلے سے موجود مذاہب کی روشنی ہی میں اپنے سفر کے آیندہ مراحل طے کرنے تھے۔ اقبال نے لکھا ہے، "اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو 'پیغمبر اسلامؐ قدیم اور جدید دنیا کے سنگم پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر آپ پر نازل ہونے والی وحی کو دیکھا جائے تو وہ قدیم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر اُس وحی کی رُوح کو دیکھا جائے تو وہ جدید دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔"[1]

جاوید نامہ کے پہلے باب میں آخری مشاہدہ طاسینِ محمدؐ ہے جو قدیم تاریخ کے ساتویں اور آخری مرحلے کو ظاہر کرتی ہے۔ وہاں ابوجہل کی روح کو، جو اسلام کی ابتدائی مخالفت

1

میں پیش پیش تھا، نوحہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ اسلام کے پیغام کا حوالہ دیتے ہوئے کہہ رہا ہے، ''اُس نے ہمارے دل جلا دیے۔ قیصر و کسریٰ کے زوال کا نغمہ گایا اور ہمارے نوجوانوں کو ہم سے چھین لیا۔ یہ مساوات، یہ مواخات— یہ تو فارسی جادُو ہے!''[1]

درحقیقت یہی مستقبل تھا:

نالندہ ترے عُود کا ہر تار ازل سے
تُو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تُو پیرِ صنم خانۂ اَسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے

ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ![2]

عبوری دَور کا آغاز

اس دوران میں عرب سے باہر کی دنیا بڑی حد تک ویسی ہی رہی جیسا ہم نے اُسے پچھلے باب میں چھٹے مرحلے کے اختتام پر چھوڑا تھا۔

تھوڑی بہت پیش رفت میں سب سے اہم برصغیر میں ۵۸۰ء کے لگ بھگ وردھن سلطنت کا قیام تھا۔ اپنے سب سے بڑے مہاراجہ، ہرش، کے دورِ حکومت (۶۰۶ء سے ۶۴۷ء) میں یہ ہندو سلطنت پورے شمالی برصغیر پر پھیل گئی اور موجودہ پاکستان کے بہت سے علاقے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ چین کے بُودھ زائر ہیون سانگ (Xuanzang)

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۵۸

[2] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۷۹

کے مطابق ہرش نے بدھ مت کی سرپرستی بھی کی۔

دُور انگلستان میں پوپ کے بھیجے ہوئے آگسٹین نے (جن کا دو تین صدیوں پہلے گزرے آگسٹین آف ہپو سے کوئی تعلق نہ تھا)، ۵۹۷ء میں کینٹربری کے گرجا کی بنیاد رکھی جو آج تک برطانیہ میں مسیحیت کے ایک اہم ترین مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں ۶۱۴ء میں ساسانیوں نے یروشلم پر قبضہ کرلیا، جسے رومیوں ہی کی نہیں بلکہ خود مسیحیت کی شکست سے تعبیر کیا جانے لگا۔ لیکن مکہ میں قرآن نے پیش گوئی کی کہ چندبرس میں (جس سے عربی میں تین سے نوبرس مراد لیے جاسکتے تھے) نہ صرف رومی دوبارہ غالب آئیں گے بلکہ اُس کے ساتھ ہی مسلمان بھی ایک شاندار فتح حاصل کریں گے (روم ۳۰:۲-۴)۔ تقریباً نوبرس بعد ۶۲۴ء میں نہ صرف رومی دوبارہ ساسانیوں کو پسپا کرنے لگے بلکہ مسلمانوں نے بھی ہجرت کے بعد پہلے بڑے غزوے، غزوۂ بدر میں، مشرکینِ مکّہ کے خلاف فتح حاصل کی۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کے آخری برسوں میں بڑی طاقتوں کو اسلام کی دعوت بھیجی گئی، جن میں ایران، روم، مصر اور حبشہ کے حکمراں شامل تھے۔ اس کے خلاف عرب کے ایک سرحدی حکمراں کی طرف سے، جو رومیوں کا باجگزار تھا، حملے کا خطرہ محسوس ہُوا تو آنحضورؐ کی قیادت میں مسلم لشکر تبوک کے مقام تک آیا۔ اگرچہ اُس وقت کسی بڑی جنگ کی نوبت نہ آئی لیکن آنحضورؐ کی رحلت کے بعد باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔

جلد ہی مسلمانوں نے ایران فتح کرلیا اور ساسانی سلطنت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ شام، فلسطین اور مصر بھی رومیوں کے اثر سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ وہ عظیم سلطنتیں جو صدیوں سے ناقابلِ شکست سمجھی جاتی تھیں، صرف دس بارہ برس کے عرصے میں یا تو ختم ہو گئیں یا غیر مؤثر ہو کر رہ گئیں۔

مسلم حکومت کا یہ ابتدائی دَور خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے، جس میں پہلے چار خلفائے کے دورِ حکومت شامل کیے جاتے ہیں: حضرت ابو بکر صدیقؓ (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء)، حضرت عمر فاروقؓ (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء)، حضرت عثمان غنیؓ (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) اور حضرت علیؓ (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء)۔ ان خلفائے راشدین کو پیغمبرؐ سے قربت کے علاوہ ان کی قیادت، سادگی، مشاورت اور احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ وقت کی عظیم ترین سلطنت پر حکومت کرنے والے یہ حکمراں کسی محافظ کے بغیر گلیوں میں گھومتے اور خود عوام کی شکایات سنتے تھے:

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں![1]

تاہم حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ادوارِ حکومت میں داخلی انتشار بھی پیدا ہوئے جس نے بالآخر مسلمانوں میں تین بڑے فرقوں کو جنم دیا جو آج تک چلے آ رہے ہیں: سنّی، شیعہ اور عبادی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ۶۶۱ء میں، شام کے گورنر حضرت معاویہؓ نے، جن کا تعلق اُموی خاندان سے تھا، اقتدار حاصل کیا۔ اُن کے دورِ حکومت کو اسلامی تاریخ میں موروثی حکومت کا آغاز سمجھا جاتا ہے کیونکہ اُنھوں نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ جب یزید نے اِس بنیاد پر حکومت کا آغاز کیا تو رسولِ اکرمؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ کے صاحبزادے امام حسینؓ نے اس حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

۶۸۰ء میں موجودہ عراق میں کربلا کے مقام پر امام حسینؓ، اُن کے خاندان اور اُن کے

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۳۳

چند جانثاروں کو یزید کے لشکر نے گھیر لیا۔ وہ پانی سے محروم کیے گئے اور آخرِ کار نہایت بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید کر دیے گئے:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اِس کی حُسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ[1]

عبوری دَور کی تکمیل

تاریخ کا ایک عجیب تضاد یہ ہے کہ جو قوتیں پرانے نظام کو گراتی ہیں وہی بعض اوقات اُس نظام کے اجزا کو خود اپنے اندر سمیٹے ہوئے بھی ہوتی ہیں۔ عربوں نے قدیم سلطنتوں کا خاتمہ کیا لیکن ان کے اپنے قبائلی اختلافات اور خاندانی سیاست خلافتِ راشدہ کے اختتام تک دوبارہ ابھر آئے۔ تاریخ کو ایک نئے دور میں داخل کرنے کے لیے صرف ظاہری فتح کافی نہ تھی۔ پرانے نظام کی باقیات کو اندر سے بھی ختم کرنا ضروری تھا۔ کربلا کا سانحہ دراصل اسی باطنی احتساب کا آغاز تھا۔

امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں نے جو جرأت دکھائی، وہ ظلم کے خلاف ثابت قدمی کی ایک لازوال علامت بن گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک اس عظیم قربانی نے اسلام میں ہمیشہ کے لیے اِس اصول کو رائج کر دیا کہ حکمرانی کسی جائیداد کی طرح وراثت میں منتقل نہیں ہو سکتی:

تا قیامت قطعِ استبداد کرد　　موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد[2]

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۹۳

[2] اقبال، اسرار و رموز، ص ۱۲۷

چنانچہ بعد میں اگرچہ اکثر مسلمان موروثی راستوں ہی سے اقتدار میں آئے لیکن اس کے باوجود اُنہیں کسی نہ کسی شکل میں عوام یا خواص کی منظوری حاصل کرنا پڑی، حتیٰ کہ مغل بادشاہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہ تھے۔ یورپ، بالخصوص ۱۰۶۶ء کے بعد کے برطانیہ میں، جو اصول رائج ہُوا جس کے تحت اقتدار بھی زمین یا مویشیوں کی طرح وراثت میں منتقل ہوتا تھا، وہ اصول اسلامی شریعت کا حصہ کبھی نہ بن سکا۔

دوسری طرف سانحۂ کربلا مسلمانوں کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑ گیا۔ اگرچہ اُموی خاندان نے ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک حکومت کی لیکن کربلا کے بعد اس خاندان کے خلاف بغاوتوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ جواب میں حجاج بن یوسف جیسے گورنروں کے تحت اموی افواج نے سخت کارروائیاں کیں یہاں تک کہ مکہ کا محاصرہ کیا گیا، منجنیق کے گولوں سے کعبہ کو نقصان پہنچایا گیا اور مدینہ میں بھی بدترین قتل و غارت کی گئی۔ اِن واقعات نے مسلمانوں میں اُموی حکومت کے خلاف نفرت کو مزید گہرا کر دیا۔

*

عام خیال کے مطابق اسی زمانے میں نجد کے صحراؤں میں قبیلہ بنو عامر کا ایک نوجوان جس کا نام قیس تھا، اپنے قبیلے کی ایک لڑکی لیلیٰ سے جدائی کے غم میں دیوانوں کی طرح بھٹک رہا تھا یہاں تک کہ اُسے مجنوں کہا جانے لگا۔ اُس نے اپنے اشعار میں اپنے جذبات کو اِتنی پاکیزگی کے ساتھ بیان کیا کہ لیلیٰ روحانی حقائق کا استعارہ بن گئی۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے کے بہت سے مسلمانوں کے لیے لیلیٰ اُن کے معاشرے کی اُس وحدت کا استعارہ رہی ہو گی جو کھو گئی تھی اور جس کے کھو جانے کا غم ہر مسلمان محسوس کر رہا تھا۔ ”میں وہ ہوں جو لیلیٰ کو دل کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ ہمارے جسم

ایک دوسرے سے دور ہیں، ہماری روحوں کا تعلق کبھی نہیں ٹوٹا"۔:

أنا الذی یری لیلی بعینِ قلبی　　　وإن غابتِ الأجسادُ، ما غابَتِ الروحُ

اُموی حکومت کے غیر مقبول زمانے میں ایک مختصر سا روشن وقفہ بھی آیا جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ۷۱۷ء سے ۷۱۹ء تک حکومت کی۔ اُن کے انصاف، احتساب اور انکساری کی وجہ سے انہیں پانچواں خلیفۂ راشد قرار دیا جاتا ہے۔

اُموی دور ہی میں فتوحات کی دوسری بڑی لہر بھی آئی جس نے مسلم سلطنت کو مغرب میں بحرِ اوقیانوس سے لے کر مشرق میں وسطی ایشیا کی سرحدوں تک پھیلا دیا اور شمال میں یہ سلطنت فرانس کے کناروں تک پہنچ گئی۔ اُس دَور کے کئی واقعات علامتی حیثیت اختیار کر گئے۔ عقبہ بن نافع کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار بحرِ اوقیانوس کے کنارے تک پہنچے، جسے بحرِ ظلمات کہا جاتا تھا، اور اعلان کیا کہ اگر سمندر آڑے نہ آتا تو وہ خدا کے پیغام کے ساتھ مزید آگے بڑھتے جاتے:

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے[1]

طارق بن زیاد نے اسپین کے ساحل پر اُترنے کے بعد واپسی کے امکانات ختم کرنے کے لیے اپنی کشتیاں جلا دیں اور آگے بڑھ کر اسپین کے بیشتر حصے میں مسلم اقتدار قائم کر دیا۔ مشرق میں، ایک نوجوان سپہ سالار جنرل محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا، جسے برصغیر میں مسلم اقتدار کی ابتدا سمجھا جاتا ہے۔ ۷۳۲ء میں فرانک فوج کے سالار چارلس مارٹل نے اسپین سے آنے والی ایک اموی فوج کو موجودہ فرانس میں جنگِ تُور میں شکست دی اور یہ معرکہ مغربی تاریخوں میں مسیحیت کے دفاع کے طور پر یادگار بن گیا۔

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۱۸۱

*

اِسی پر آشوب دَور میں وہ لوگ بھی تھے جو صرف اسلام کی حقیقی رُوح کو محفوظ کرنے میں سرگرم تھے۔ یہ رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیت، صحابہ کرام، اُن کے شاگرد، فقہا اور صوفیا تھے۔ اہلِ بیت میں سے امام زین العابدینؒ اور امام جعفرؒ اِسی زمانے میں گزرے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے شاگردوں میں سے، جنہیں اصطلاحاً ''تابعین'' کہا جاتا ہے، حضرت حسن بصری نے حکمرانوں پر بے لاگ تنقید، دین کے اخلاقی پہلوؤں کے ساتھ گہری وابستگی، اور مکمل پاکیزگی اور سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرکے اسلام کی اصل روح کو معاشرے کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کی ایسی مثال پیش کی جو بعد میں تصوّف کے لیے ایک صحتمند بنیاد بن گئی۔ سعید ابن مصعب جیسے تابعین نے فقہ کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔

لیکن انسانی ذہن کی ترقی میں ایک حیرت انگیز کردار اُن لوگوں نے ادا کیا جنہیں محدثین کہا جاتا ہے۔

اِس سے پہلے کے تقریباً تمام مذاہب میں اُن مذاہب کے بانیوں سے منسوب اقوال اور اُن کے حالاتِ زندگی پر یقین کرنے کو ایمان کا نام دیا گیا تھا۔ اسلام نے گویا اِس طرزِ فکر کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی کو علیحدہ مرتب کرکے قرآن کی شکل دے دی اور یہ کام پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی زندگی میں خود اپنی نگرانی میں کروایا۔ قرآن کے سوا اور کسی بات پر یقین کرنے سے پہلے اُس کی مکمل تحقیق کو لازمی قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بات پیغمبرؐ سے منسوب کی جائے (جسے اسلامی اصلاح میں ''حدیثِ نبوی'' کہا جاتا ہے)، تو اُس کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ اُس پر یقین کرنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کی جائے کہ پیغمبرؐ نے واقعی وہ بات کہی تھی یا نہیں۔ بلا تحقیق کسی حدیث

پر یقین کر کے اُسے آگے پھیلانا ایک گناہ قرار پایا۔

اِس لیے ایک نئے علم کی بنیاد پڑنے لگی، جسے علمِ حدیث کہا جاتا ہے، اور جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر کے علمی نظاموں میں ایک انقلابی اقدام تھا۔ اس میں روایت کی جانچ کے لیے جو اصول بنائے گئے، جیسے سند کی تحقیق، راویوں کی سوانح، روایت کی درجہ بندی، مختلف علماء کے ذریعے باہمی تصدیق اور زبانی تاریخ کا منظم اندراج، وہ سب غیر معمولی طور پر منظم اور سائنسی انداز رکھتے ہیں۔ آگے چل کر یہی طرزِ فکر جدید سائنس کی بنیادیں رکھنے والا تھا۔

اموی دور کے آخر میں پوری سلطنت میں بغاوتیں زور پکڑ گئیں۔ ۷۵۰ء میں عباسی خاندان نے، جو پیغمبرِ اسلامؐ کے چچا حضرت عباسؓ سے نسبی تعلق رکھتا تھا، اموی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

شاہی خاندان کے اکثر افراد قتل کیے گئے۔ صرف عبد الرحمٰن بن معاویہ زندہ بچ سکا۔ وہ شمالی افریقہ کے راستے فرار ہو کر اسپین پہنچا اور وہاں اموی اقتدار کو دوبارہ قائم کیا۔

بنو امیہ کا خاتمہ اور بنو عباس کی حکومت کا آغاز صرف اقتدار کی تبدیلی نہ تھی۔ یہ قدیم دنیا سے تعلق رکھنے والی آخری کڑی کے ٹوٹنے کا عمل بھی تھا۔ اموی سلطنت اگرچہ مسلمانوں میں سے اُٹھی تھی لیکن اُس میں وہ صفات بھی موجود تھیں جنہیں ختم کرنا اسلام کا مقصد تھا۔ اب زمانے کی لہر تیار تھی کہ تاریخ کے جدید دَور کا آغاز کرے۔

ایک نیا تصوّرِ حیات

جس تصوّرِ حیات نے انسانی تاریخ کے جدید زمانے کو جنم دیا ہے، اقبال کے مطابق وہ پہلے

پہل اسلام نے پیش کیا تھا۔ اِس تصوّرِ حیات کی دریافت ہی ایک طرح سے قدیم زمانے کی تاریخ کا حاصل ہے۔

اگرچہ تمام پیغمبروں کے پیغامات توحید پر مبنی تھے اور اُن کی بے پناہ توانائی نے انسانی تہذیب کو آگے بڑھایا لیکن اُن پیغمبروں کے پیروکاروں نے اُن کی تشریح اپنے اپنے لحاظ سے پیش کی۔ اُن تشریحات کی وجہ سے انسان اور کائنات کے بارے میں مندرجہ ذیل تصوّرات سامنے آئے:

- بدھ مت نے یہ تصوّر اخذ کیا کہ دنیا دُکھوں کا گھر ہے اور انسان اپنی انفرادی حیثیت میں بدی کا مجسمہ ہے۔ اِس لیے اپنی روح کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہی اصل نجات ہے۔
- زرتشتی مذہب نے یہ تصوّر اخذ کیا کہ فطرت میں خیر اور شر کی دائمی کشمکش ہے۔ اِس لیے اچھائی اور برائی کی اِس جنگ میں شریک رہنا ہی انسان کی نجات ہے۔
- مسیحیت نے یہ تصوّر اخذ کیا کہ فطرت میں گناہ ہے اور انسان پیدائشی طور پر اُس گناہ کا ایک حصہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کے مطابق اسلام نے جس تصوّرِ حیات پر معاشرے کی بنیاد رکھی وہ یہ تھا کہ:

- انسان کی اصل فطرت اُس کے ارادے میں مضمر ہے۔
- انسان فطرتاً نیک ہے۔
- تمام برائیوں کی اصل جڑ خوف ہے، جو خدا پر مکمل ایمان نہ ہونے یا اپنے ماحول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔
- خوف اور غم سے آزاد ہو جانا ہی اصل نجات ہے۔

کئی صدیوں کے بعد بالآخر اِسی تصوّرِ حیات کو پوری دنیا نے قبول کر لیا۔ لٰہذا آج تقریباً پوری دنیا کا نظام اِسی تصوّرِ حیات پر قائم ہے، جیسا کہ ہم اِس کتاب کے اگلے حصے میں دیکھیں گے۔[1]

ضروری نہیں ہے کہ بدھ مت، زرتشتیت اور مسیحیت سے جو تصوّرِ حیات اخذ کیے گئے وہ اُن مذاہب کی اصل تعلیمات کا مکمل عکس ہوں۔ اِس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن مذاہب کے دامن میں آج بھی ایسے نکات موجود ہوں جنہیں دریافت کر کے اُن مذاہب کے پیروکار انسان کی مزید ترقی کے لیے نئے راستے روشن کر سکیں۔ قرآن خود ایسی کاوشوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ وہ پچھلے تمام پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہوئے اُن کے پیروکاروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ توحید کی بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو جائیں۔

اب ہم آخری اہم سوال کی طرف آتے ہیں کہ قدیم زمانے کا اختتام ہونے کے بعد انسانیت کس سمت میں جا رہی ہے اور کس مقصد کے ساتھ؟ اگرچہ اِس کا مفصل جواب اگلی کتاب حضرتِ انسان میں سامنے آ رہا ہے لیکن یہاں ایک مختصر جائزہ ضرور لیا جا سکتا ہے۔

جدید تاریخ کی ایک جھلک

جب ابراہیم نے کہا، ”اے میرے رب! مجھے دکھایئے کہ آپ مُردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں۔ فرمایا، ”کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟“ عرض کیا، ”کیوں نہیں! لیکن یہ اس لیے ہے تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔“ فرمایا، ”تو چار

---

[1] یہ تمام نکات اقبال نے ۱۹۰۹ء میں اپنے مقالے 'Islam as a Moral and Political Ideal' میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مقالے کے متن کے لیے دیکھیے: Latif Ahmad Sherwani (ed.), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*

پرندے لو۔ اُنہیں اپنے سے مانوس کرو۔ پھر اُن کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر اُنہیں بلاؤ۔ وہ تمہاری طرف دوڑتے ہُوئے آئیں گے۔ اور جان لو کہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔"(البقرہ ۲:۲۶۰)

قرآن میں بیان کیے گئے اِس واقعے میں حضرت ابراہیمؑ خدا کی ایک صفت کو اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے محسوس کرنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ یہاں وہ صفت موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی طاقت ہے لیکن ظاہر ہے کہ خدا کی اور بھی صفات ہیں۔ اکثر مذاہب میں یہ تصوّر موجود ہے کہ حقیقت کی کئی تہیں ہوتی ہیں اور ہر تہہ خدا کی کسی نہ کسی صفت کو ظاہر کرتی ہے۔ قرآن میں خدا کی جن صفات کا ذکر ہے، اقبال کے مطابق اُنہیں پانچ بڑے زمروں میں سمویا جا سکتا ہے، جنہیں اقبال نے خدا کے قرآنی تصوّر کے پانچ اجزا قرار دیا ہے۔ ہم اِنہیں تصوّرِ خدا کے پانچ پہلو بھی کہہ سکتے ہیں:

۱ خدا ہمیشہ رہنے والا ہے

۲ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے

۳ خدا سب کچھ جانتا ہے

۴ خدا تخلیق کرتا ہے

۵ خدا کی ذات لامحدود ہے

جدید تاریخ کو دیکھنے کا ایک انداز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ تاریخ کے قدیم زمانے میں انسانیت نے سات مراحل سے گزر کر اپنی روحانی تکمیل کی تھی، اِس لیے اُس کے بعد سے انسانیت تصوّرِ خدا کے پانچوں پہلوؤں کو باری باری اپنے تجربے میں لانے کی کوشش کر رہی ہے، بالکل اُسی طرح جیسے حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی ایک صفت کو محسوس کرنے کی خواہش کی تھی۔

مثال کے طور پر اِس تصوّر کے تیسرے پہلو کو لیجیے کہ "خدا سب کچھ جانتا ہے" (فلسفیانہ اصطلاح میں اِسے علمِ کامل یعنی Omniscience کہتے ہیں)۔ آج سے تقریباً تین سو برس پہلے تک یہ تصور محض ایک عقیدہ تھا جسے عوام مذہبی بنیادوں پر تسلیم ضرور کرتے تھے لیکن عقلی طور پر سمجھ نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ایک عام شخص کے مشاہدے میں کوئی ایسی مثال موجود نہ تھی جو اِس بات کو سمجھنے میں مدد دے سکتی۔ چند پہنچے ہوئے لوگ شاید اپنی سخت ریاضت اور غیر معمولی روحانی ترقی کی بدولت اِس کی جھلک پا لیتے ہوں، جیسا کہ بزرگوں اور صوفیائے کرام کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ لیکن عوام کے لیے یہ صرف ایک عقیدہ تھا، ایک تجربہ نہیں۔

لیکن اب اُس زمانے سے تین سو برس آگے آ جائیے اور آج کی دنیا کو دیکھیے۔ آج نہ صرف ایک عام انسان بلکہ آٹھ دس برس کے بچے بھی علمِ کامل کا ایک ابتدائی سا اندازہ ضرور رکھتے ہیں کیونکہ میڈیا، انٹرنیٹ، مصنوعی ذہانت اور سینسر نیٹ ورکس کے ذریعے دنیا کے ہر کونے میں ہونے والے واقعات کو بیک وقت جاننے کے چھوٹے موٹے نمونے تو ہر شخص کے روزمرہ تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہیں۔ اِن کی روشنی میں خدا کے علمِ کامل کو سمجھنے کے لیے بس یہی کہنا کافی ہو جاتا ہے کہ اگر یہ انسانی سطح پر "سب کچھ جاننے" کی ایک محدود سی صلاحیت ہے تو سمجھ لیجیے کہ جس نے انسان کو بنایا ہے، اُس کا "سب کچھ جاننا" اِس کے مقابلے میں کتنا لامحدود ہو گا!

دُوسرے لفظوں میں ہم ایک ایسا سماجی، فکری یا تکنیکی ماحول پیدا کر چکے ہیں جہاں ایک عام انسان بھی خدا کے تصوّر کے ایک مخصوص پہلو ("خدا سب کچھ جانتا ہے") کو کسی حد تک محسوس کر سکے، محدود پیمانے پر لیکن اخلاقی معنویت کے ساتھ!

بالکل اِسی طرح خدا کے تصوّر کے دوسرے پہلو بھی جدید تاریخ کے ایک ایک دَور

میں ترتیب وار ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ ترتیب کچھ اِس طرح بنتی ہے:

- ۷۵۰ءسے ۱۲۵۸ء: خدا ہمیشہ رہنے والا ہے
- ۱۲۵۸ء تا ۱۷۴۷ء: خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے
- ۱۷۴۷ء تا حال: خدا سب کچھ جانتا ہے

اِس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگلے دو ادوار، جن کے آغاز اور اختتام کی تاریخیں ہم فی الحال متعین نہیں کر سکتے ہیں، مندرجہ ذیل خصوصیات سے عبارت ہوں گے:

- خدا تخلیق کرتا ہے
- خدا کی ذات لامحدود ہے

یہ دعویٰ نہیں کیا جارہا کہ تاریخ کو دیکھنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ ہر طرح کے ڈیٹا کی مختلف تشریحات ہو سکتی ہیں اور تاریخ بھی ایک ڈیٹا ہے، جسے مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن تاریخ کے ڈیٹا کو اِس طرح دیکھنے کی خوبی یہ ہے کہ یہ انسانوں کی اکثریت کے مزاج کے مطابق ہے کیونکہ آج بھی انسانوں کی اکثریت کسی نہ کسی انداز میں خدا پر ایمان رکھتی ہے۔

لیکن تاریخ کو اِس طرح دیکھنے کا اصل فائدہ اور اِس کی سچائی کا اصل امتحان یہ ہے کہ ہم اِس کی مدد سے مستقبل کا اندازہ لگانے، خطرات کو بھانپنے اور عملی حل تجویز کرنے میں کس حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اگلی کتاب حضرتِ انسان میں آپ کے سامنے آ رہا ہے:

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالَم ہے نورانی[1]

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص۲۷۹

حوالے

اقبال، علامہ سر محمد[1]۔[تاریخ ندارد]۔اَسرار و رموز۔ لاہور[شائع کنندہ: مصنف]

۔۔۔۔۱۹۳۰۔ بانگِ درا[طبعِ مکرر]۔ لاہور[شائع کنندہ: مصنف]

۔۔۔۔۱۹۳۲۔ جاویدنامہ۔ لاہور[شائع کنندہ: مصنف]

۔۔۔۔۱۹۳۵۔ بالِ جبریل۔ لاہور[شائع کنندہ: مصنف]

۔۔۔۔۱۹۳۶۔ ضربِ کلیم۔ لاہور[شائع کنندہ: مصنف]

۔۔۔۔۱۹۳۶۔ ارمغانِ حجاز۔ لاہور[شائع کنندہ: مصنف]

برنی، مظفر حسین برنی(مرتب)۔۱۹۹۳۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول۔ دہلی: اُردو اکادمی

۔۔۔۔(مرتب)۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم۔ دہلی: اُردو اکادمی

شفیق، خرم علی۔ ۲۰۱۹۔ اقبال کی منزل۔ لاہور: رائٹ وژن پبلی کیشنز

Iqbal, Dr. Sir Muhammad. 1934. *The Reconstruction of Religious Thought in Islam.* London: Oxford University Press

Sherwani, Latif Ahmad; ed. 1995. *Speeches, Writings and Statements of Iqbal.* Iqbal Academy Pakistan, Lahore

[1] اقبال کی مختلف تصانیف پر مختلف طریقوں سے نام لکھا ہے۔ یہاں سب کو علامہ سر محمد اقبال کے تحت رکھا جا رہا ہے۔

خرّم علی شفیق

اقبال سائنسز سیریز

اقبال سائنسز (Iqbal Sciences) سے مراد یہ ہے کہ تمام سماجی علوم کو نئے سرے سے اُن اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے جو علامہ اقبال نے متعین کر دیئے تھے۔ یہ زاویۂ نگاہ معروف ماہرِ اقبالیات خرّم علی شفیق کی تحقیقات کا نتیجہ ہے، جسے وہ ۲۰۰۷ء سے اپنی تصانیف میں پیش کر رہے ہیں۔ اب الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت اِس نئے علم کے خلاصے کو ایک باقاعدہ سیریز کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جسے خرّم علی شفیق نے خود تصنیف کیا ہے۔

یہ کتابیں سب کے لیے ہیں کیونکہ ان میں جو تحقیقات پیش کی جا رہی ہیں اُن سے اہلِ علم بھی عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ اِس لحاظ سے اِن کتابوں کی ضرورت طلبہ کو بھی ہے، اور ماہرین اور اساتذہ کو بھی!

الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت پیش کی جانے والی یہ سیریز نو کتابوں پر مبنی ہیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ مکمل ہے اس لیے قارئین اپنے ذوق کے لحاظ سے اِن میں سے کسی بھی کتاب سے آغاز کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر کتاب میں دُوسری کسی نہ کسی کتاب کا حوالہ بھی شامل ہے اِس لیے آپ ان کتابوں کو جس ترتیب میں بھی پڑھیں گے، بہر حال وہ آپس میں مربوط ہوتی چلی جائیں گی۔

مصنف اور ناشر کی طرف سے اِن کتابوں کو جس ترتیب میں رکھا گیا ہے، وہ اگلے صفحے پر ہر کتاب کے موضوع کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔

اقبال سائنسز کی کتابیں

مصنف: خرّم علی شفیق

ناشر: الہجرہ سکولز ٹرسٹ

زندگی کی کتاب

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سرگزشتِ آدم

قدیم زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

حضرتِ انسان

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سیمرغ

عطار کی منطق الطیر اقبال کی نظر سے

آزادی

تحریکِ پاکستان کی مختصر تاریخ

آزادی کے بعد

پاکستان کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے ۲۰۲۶ء تک

قومی ادب

پاکستانی ادب اقبال کی نظر سے

قائد اعظم کے سیاسی اصول

علمِ سیاسیات اقبال کی نظر سے

اقبال کا فلسفہ سب کے لیے

فکرِ اقبال کے نَو بنیادی اصول

سرگزشتِ آدم

قدیم زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

خرّم علی شفیق

تاریخ صرف ماضی کا ریکارڈ نہیں ہے بلکہ فطرت کی ایک ایسی قوت ہے جو ایک عظیم مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اُسے پہچان کر آپ صرف ماضی ہی نہیں بلکہ مستقبل کے بارے میں بھی صحیح اندازے لگا سکتے ہیں۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے منفرد نقطۂ نگاہ سے قدیم زمانے کے انسان کی کہانی ایک نئے انداز میں بیان کرتی ہے جو آپ کو چونکا دے گی۔ انسانیت کے ارتقا کے سات مراحل کا سفر کیجیے اور دیکھیے کہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی نے اُس کی کہانی کو کیسے رنگین کیا۔ یہ ہمارے زمانے کے لیے تاریخ کی ایک نئی تعبیر ہے۔

9786277400033

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

وقف الهجرة
AL-HIJRAH

Art: Khurram Ali Shafique using AI | Design: Syed Ahsan Ali